رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۰۷

ہندوستانی خریداروں کے لیے ارسال زر کا پتہ:
مینیجر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

ماہنامہ میثاق لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق جمادی الاول سنہ ۱۳۷۹ھ | عدد ۷

تذکرہ و تبصرہ ——— امین احسن اصلاحی ——— ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ ——— 〃 ——— ۹

بحث و نظر

خلافت کے لیے قرشیت کی شرط اور اسلام کا اصول مساوات ——— 〃 ——— ۲۰

سفر حج

حج کے بعد ایک ماہ مکہ معظمہ میں ——— 〃 ——— ۳۳

اقتباسات و تراجم

ایک شہنشاہِ وقت اور ایک فقیر بوریا نشین ——— جناب خالد مسعود صاحب ——— ۵۲

★

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق ۱۱۔ احمد سٹریٹ ۱۔ رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

کوالالمپور (ملایا) سے ایک محترم بزرگ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں ہمیں ایک خاص مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس پر اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے۔ ہم موصوف کی چٹھی کے ضروری حصے ان صفحات میں نقل کرکے اس پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ موصوف لکھتے ہیں:—

"غیر مسلم اقوام کی محکومی سے مسلمانوں نے سیاسی آزادی کے حصول کے بعد تعمیر کے بدلے تخریب اختیار کی ہے۔ آزادی کسی تربیت یافتہ احساس و شعور کے بدلے میں نہیں حاصل ہوئی بلکہ محض اتفاقی حادثہ کے طور پر۔ کسی تخلیقی اور تعمیری محرک (CREATIVE & CONSTRUCTIVE IMPULSE) کا وجود نہیں تھا بلکہ خلا موجود رہا جس کو جذبۂ تخریب نے پُر کیا ہے۔ یہ کلیہ مسلمانوں کی سیاسی، ذہنی، فکری، معاشی، اخلاقی ہر شعبۂ زندگی انفرادی اور اجتماعی پر حاوی ہے۔ تفکر و تدبر قیادت صرف حرف بے معنی ہے۔ جسمانی اعتبار سے ایک طرف آزادی حاصل کی، ساتھ ہی ذہنی اعتبار سے اپنے آپ کو حوالہ کر دیا۔ مادی اور معاشی اعتبار سے بھی رو بہ تنزل ہیں۔ وجہ یہ کہ نہ شوقِ سفر ہے اور نہ کوئی منزل (NO SELF NITIATIVE NO DESTINY) یہی حال تعلیمی اور فکری منزل کا بھی ہے۔ اسلام کا وجود رسوخ اعتقادات سے ہے مگر اب ہر طرف خود مسلمان یہ کوشش کر رہا ہے کہ یہی گرفت توڑ دی جائے۔"

"اپنے اسراف و تبذیر اور عیاشی و اوباشی کی بنا پر قرض داری میں بذات خود گرفتار ہو کر سود لے کر نہیں سود دے کر جس قوم نے صدیوں سے اپنے آپ کو افلاس و قلاشی میں ڈبو رکھا ہے وہ مسلمان ہی ہیں۔ اور آج بھی ڈوبتا جا رہا ہے۔ یہ افلاس و قلاشی کا مرض اس قوم کے لیے اقرّالجرائم ثابت ہو رہا ہے۔ یہ قوم صدیوں سے اپنی نااہلی اور نالائقی (INCAPACITY & IMPOTENCY) کی تلافی اپنا خون دوسروں کے ہاتھوں ارزاں کرکے یا دوسروں کا خونِ ناحق بہا کر کرتی رہی ہے۔ اور آج بھی ہماری سیاست کی بساط صرف یہ ہے کہ ہم اپنے بقائے وجود کے لیے کرایہ کے قصائی کی طرح کسی سے اجرت وصول کرنے کی خاطر کسی کی گردن کاٹنے کو تیار ہیں۔ ہماری نہ کوئی سیاسی زندگی ہے، نہ کوئی سیاسی مقصد ہے، نہ کوئی سیاسی منزل ہے، نہ کوئی سیاسی تخیل۔"

"مسلمانوں میں قیادت کا معیار اس سے زیادہ نہیں کہ برادری کی دعوت میں کھانا کھلوانے کی نگرانی کیسے حاصل ہے۔ محلہ کی مسجد اور مدرسہ کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کون چندہ مانگ کر لاتا ہے اور ہمیں اُن ضروریات سے فراغت دلاتا ہے۔ تحریک ..... بھی اپنی کمیت کی وسعت کے باوجود ان نام نہاد لیڈروں کے ہاتھ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ آج بھی جمعیۃ ..... کی تمام و کمال امدادی کام RELIEF WORK سے زیادہ نہیں۔ ہمارے مذہبی مدارس صرف ایک مضبوط مذہبی عصبیت قائم و باقی رکھنے کے سوا کسی اور مصرف کے نہیں۔ ہمارے علوم جدیدہ کے ادارے صرف غیر ملکی زبان کے سکھانے اور نوکری کے قابل بنانے کے سوا کسی مصرف کے نہیں۔ یہی حال یہاں ملایا میں بھی ہے اور یہی عالم اسلامی کے گوشے گوشے میں ہے۔ ہم جدید اور مغرب کے پیدا کردہ علوم و فنون کی تہہ یا بلندی تک نہ پہنچے ہیں اور نہ پہنچیں گے۔ ہماری پستی، پست ہمتی اور احساس کمتری (INFERIORITY COMPLEX) ہمیں اُن سے متنفر رکھتی ہے اور ہم اپنے ذاتی عیب کو ایمان و اعتقاد کے نام کے پردے میں چھپانے کے لیے ان علوم سے تعصب کرکے اُن علوم کو مذہب کا مخالف اور حریف بتلاتے ہیں، حالانکہ اندلس میں انہیں علوم کو یہودیوں نے ہم سے حاصل کیے تو نہ وہ ملحد ہوئے اور نہ مسلمان بلکہ آج بھی یہودیت موجود ہے اور علوم سے مالا مال۔ انہیں یہودیوں کی شاگردی کرکے یورپ نے ہمارے علوم کی وراثت حاصل کی اور اس میں ناقابلِ تخیل اضافہ کیا کہ اب اُن کا تعاقب محال نظر آتا ہے۔ مگر مسیحیت وہی موجود ہے اور علوم سے مالا مال۔"

"مامون عباسی کا بیت الحکما، علوم یونانی کو مدفن سے نکال کر نئی جان دے سکتا تھا۔ اگر علمائے یونان کا جلا وطن کردہ گروہ ایران میں پناہ لے کر پرسی پولس (PERSIPOLIS) کا مدینۃ العلوم آباد کر سکتا تھا، تو پھر ہمارے لیے بھی ایک شعاع امید باقی ہے اور وہ یہ کہ تعصب سے پاک ہو کر اور اپنے اعتقاد دین کی از سر نو تصدیق کرتے ہوئے کہ تمام علوم ظنیات ہیں، ناقص انسانی مشاہدات و تجربات ہیں اور یہ ہرگز دین حنیف کی حقانیت پر غالب نہیں ہونگے ہم اُن علوم کو اس طرح حاصل کریں کہ ہم ان کو اپنا بازیچہ سمجھیں۔ ہم اُن علوم کے مراکز میں دخیل بن جائیں ان علوم کو ہم سے مغایرت باقی نہ رہے۔ جب ہم اُن میں محلول ہو گئے یا اُن کو اپنے اندر جذب کر لیا تو اب مغایرت اور انفصال باقی نہ رہا اور اسی درجہ پر ہمیں اُن پر استاذی اور مشاقی و (AUTHORITY) قیادت یا غلبہ حاصل ہوگا۔ اور یہ فکری اور ذہنی آزادی اور استقلال بنیاد ہوگی تمام شعبہائے زندگی کے لیے انفرادی ہو یا اجتماعی۔"

" فعال اقلیت (PRODUCE THE CREATIVE MINORITY) پیدا کیجیے کیونکہ یہ چیز خیر القرون اور زمانۂ صحابہ کے بعد سے کم سے کم تر ہوتے ہوئے صدیوں سے معدوم کے برابر ہے۔ اگرچہ انفراداً موجود رہی۔"

"گذشتہ بیس سال میں دنیا تہ و بالا ہو گئی قوموں کو اپنے ہزاروں سال کے مواطن ترک کرنا پڑے اور وہ مہاجرت میں معدوم ہو رہی ہیں۔ اور یہ سانحہ بخاری و ترمذی، سینا و فارابی کی قوم کو بھی پیش ہے۔ اپنے مواطن چھوڑ کر اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے موت خرید رہے ہیں۔"

"مغربی جرمنی، آسٹریا، اٹلی، فرانس، امریکہ وغیرہ ممالک میں منتشر ہو کر صدا بصحرا کی طرح ایک نہ ایک روز نابود ہو جائیں گے۔ بعض حساس دل مسلمان اور وہ بھی انھیں کے ہم وطن اپنے وطن سے صدیوں سے بچھڑے ہوئے ان نو گرفتاروں سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ اور عالم اسلامی کو شرکت کی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر یہ تمام وقتی امداد (EVENTUAL RELIEF) سے زیادہ کچھ نہیں۔ آج بھی یہ تازہ دم اٹھنے والے صحرا کے شیر سینا و فارابی کے وارث بن سکتے ہیں۔"

" میرا یہ ذاتی خیال اور آرزو ہے کہ یہودیوں کی طرح ہم آج کی متمدن دنیا اور اقوام کے

مراکز میں ان کی رگ رگ میں داخل و شامل ہو جائیں استقامۃ بدین الاسلام کے سوا وطن پرستی اور زبان پرستی اور پگڑی پرستی کو چھوڑ دیں اور اس سے بنیادی مقصد اُن علوم پر تغلب حاصل کرنا ہو جن کی وجہ سے ہم مغلوب ہیں اور دوسرے ہم پر غالب۔"

"حالت یہ ہے کہ ہزاروں ترک و تاتار مہاجرانہ مغربی جرمنی اور اس کے گرد و نواح میں بکھرے ہوئے موجود ہیں۔ ہر مہینہ سینکڑوں کی تعداد میں مشرق یورپ کو ترک کر کے اس طرف آ رہے ہیں۔ ان کو کسی مناسب منتخب کردہ مقام میں آباد ہونے کی ترغیب دی جائے اور کم از کم اُن کے ایمان کی حفاظت کے وسایل بہم پہنچائے جائیں۔ زندگیاں تکلیفوں میں بھی گذر کر رہیں گی، مگر اُن کی اولاد کی تعلیم و تربیت اس اسلوب و انداز پر ہو کہ وہ ہمارے لیے فعال اقلیت (CREATIVE MINORITY) کا سنگ بنیاد ثابت ہو۔ اور ایسا مقام عالم اسلامی کے لیے حصول علم کا مرکز اور یورپی ممالک میں اسلامیت کا قرطبۂ جدید ثابت ہوگا۔ امید افزا بات یہ ہے کہ حکومت مغربی جرمنی نیز حکومت اوسٹریا ان مہاجرین کے ساتھ صرف بے تعصبانہ ہی نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے۔ اور علمی اعتبار سے جرمن قوم اپنی علمی و عقلی اپج اور حوصلہ (GROUTH & VIGOR) کے اعتبار سے دنیا پر فائق ہے۔ ہاں صرف روپیہ خرچ کرنا اور آدمیوں کے انبوہ کو یکجا جمع کر دینا نتیجہ نہیں لا سکتا۔ سب سے بڑا مرحلہ ایسی تربیتی اور تعلیمی نو آبادی (TRAININGOR EDUCATIONAL SETTLEMENT) کی قیادت ہے اور وہی حکیم اسلام اقبال کے حسب تخیل جس کو انھوں نے ۱۹۳۲ء میں شیخ الازہر کے نام ارسال کردہ خط میں ظاہر کیا تھا۔ کاش کہ اقبال آج زندہ ہوتے۔"

"اگر ان مسلمانوں کو ناموس دین مصطفےٰ کا حامی و ناصر بنا کر زندہ رکھنا ہو تو فعال اقلیت شرط ہے ورنہ یہ زندہ بھی رہے ان کی حکومتیں باقی بھی رہیں تو صرف یہ اجرت کے قصائی ہوں گے۔ اپنے ذاتی اغراض کی خاطر ہمیشہ اپنے ہی اخوان المسلمین کے خرمن امن پر بجلی بن کر گرتے رہیں گے جیسا کہ تاریخ گواہ ہے۔"

"مجھ میں کتابت و مراسلت کی استطاعت نہیں۔ آپ اکیلے ہی نہیں بہت سے زندہ دل و روشن ضمیر توجہ کریں اور کمر بستہ ہوں۔"

"تقریباً دس لاکھ روپیہ کی میری موقوفہ جائداد میں اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے مختص کر سکتا ہوں۔ آپ پوری سنجیدگی انہماک اور توجہ سے اس معروض کو سمجھنے کی کوشش کریں اور مشورہ مفصل تحریر کریں، ممکن ہو تو پورے مضمون کی شکل میں۔"

اس چٹھی کے تمام مندرجات سے پورا پورا اتفاق کرنا تو ہمارے لیے مشکل ہے لیکن اس میں جو اصل بات پیش کی گئی ہے اس کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے اس کی زبان اور اس کے بعض خیالات سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم نے اس کو ان صفحات میں درج کر دیا ہے تاکہ جو لوگ مسلمانوں کے مسائل پر غور کرتے رہتے ہیں، وہ اس پر غور کر سکیں۔ اور اگر کوئی صاحب محترم مکتوب نگار کو اس بارے میں کوئی مشورہ دینا چاہیں تو وہ مشورہ دے سکیں۔ یہ مشورے اگر اشاعت کے لیے موزوں نظر آئے تو ان صفحات میں بھی شائع ہو سکتے ہیں اور اگر اشاعت کے لیے موزوں نظر نہ آئے تو صاحب مکتوب کو براہ راست بھیجے جا سکتے ہیں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی اور صاحب مکتوب نے اجازت دی تو ہم ان کا پتہ بھی ان صفحات میں شائع کر دیں گے۔

ہم نے میثاق کے پچھلے شمارے میں سعید رمضان صاحب کی ایک اسکیم شائع کی ہے۔ اس اسکیم میں موصوف نے یورپ کے کسی موزوں مقام پر ایک اسلامی مرکز کے قیام کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس مرکز کے جو اہم مقاصد انھوں نے ظاہر کیے ہیں ان میں ایک اہم مقصد یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ ان مسلمان اقلیتوں کی نگرانی اور رہنمائی کرے گا جو یورپ کے مختلف ملکوں میں آباد ہیں لیکن کوئی صحیح رہنمائی اور نگرانی نہ حاصل ہونے کے سبب سے اکثریت کے مذہب اور تمدن میں تحلیل ہوتی جا رہی ہیں۔ سعید رمضان صاحب نے غالباً وسائل و ذرائع کا خیال کر کے اس مرکز کے کام کو ایک خاص حد ہی تک محدود رکھا ہے، لیکن اگر اس مرکز کو وسائل و ذرائع حاصل ہو جائیں تو یہ اس قسم کی نوآبادی کے قیام اور اس کی رہنمائی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے جس قسم کی نوآبادی کی ضرورت کا اظہار صاحب مکتوب نے فرمایا ہے۔

اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کی کوئی موثر اور مفید خدمت وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کو ایک طرف اسلام میں رسوخ حاصل ہو اور دوسری طرف موجودہ سائنس اور فلسفہ میں بھی رسوخ حاصل ہو۔ اس طرح کے اشخاص و افراد کی کمی تو پہلے بھی ہماری قوم میں تھی لیکن اب تو یہ قوم ایسے رجال سے بالکل ہی خالی ہوتی جا رہی ہے، اور نہایت بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ایسے اشخاص پیدا کرنے کا کوئی انتظام بھی اس وقت موجود نہیں ہے۔ ایسے اشخاص تعلیمی اداروں ہی سے پیدا ہو سکتے تھے لیکن ہمارے تعلیمی ادارے، خواہ جدید طرز کے ہوں یا قدیم طرز کے، اس طرح کے اشخاص پیدا کرنے کے لیے بالکل ہی بانجھ واقع ہوئے ہیں۔ جہاں تک مذہبی اداروں کا تعلق ہے اگر وہ بری بھلی دینی تعلیم کا کچھ انتظام کرتے ہیں تو انھیں جدید سائنس اور فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں اور اس کے بالکل برعکس ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا حال یہ ہے کہ اگر یہ جدید فلسفہ اور سائنس کی تعلیم دیتے ہیں تو انھیں مذہب اور مذہبی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مشہور ادیب جاحظ نے اپنے زمانہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس زمانہ میں دین ہے تو اس کے ساتھ عقلیت نہیں اور اگر عقلیت ہے تو اس کے ساتھ دین نہیں۔ جاحظ کا یہ تبصرہ اس کے اپنے زمانہ کے متعلق صحیح ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے اس دور کے متعلق تو اس کا یہ تبصرہ سو فیصدی صحیح ہے۔ اس زمانہ میں اگر مذہب ہے تو سائنس اور فلسفہ سے بیزار اور اگر سائنس و فلسفہ ہے تو مذہب سے متنفر اور باغی۔

اس صورت حال نے مذہب اور اہل سائنس میں ایک سخت قسم کی کشمکش اور جنگ کی حالت پیدا کر دی ہے اور سائنس کے حامیوں کا خیال یہ ہے کہ اس جنگ میں سائنس کا پلہ بھاری ہے۔ سائنس کی فتوحات جتنی ہی بڑھتی جا رہی ہیں اسی نسبت سے اہل سائنس کا غرور بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ سائنس کے موجودہ چیلنج کا مذہب کے پاس کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ یہ خیال پیدا ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ خدانخواستہ مذہب، کم از کم جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، کوئی ایسی بودی چیز ہے جس کو عقل اور تجربہ کے آگے کبھی شرمندہ ہونا پڑے۔ انسان کی عقل اور اس کے تجربات میں جتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا اتنا ہی اسلام کا جوہر نکھر نکھر کر سامنے آئے گا لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اسلام کے حقائق کو واضح کرنے کے لیے بھی ایک ایسا گروہ میدان میں موجود ہو جس نے مذہب کو عقل کی کسوٹی پر

پڑھا لکھا ہو اور عقل کو مذہب کی روشنی سے جلا دی ہو۔

تاریخ کے اس دور میں اس قسم کے راسخین فی العلم ہی اسلام کی، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، کوئی خدمت کر سکیں گے۔ لیکن اس قسم کا کوئی گروہ اس وقت نہ تو ہمارے اندر موجود ہی ہے اور نہ اس کے پیدا کرنے کا، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، کوئی انتظام ہی ہے۔ اس وجہ سے ان سارے لوگوں کا جو اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں اس وقت سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ ہر ملک کے اندر ایسے راسخین فی العلم تیار کرنے کی فکر کریں جو اس جدید فکری کشمکش میں اسلام کی صحیح نمائندگی اور وکالت کے لیے پوری طرح اہل ہوں۔ اس کے لیے سب سے پہلی چیز جس کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس مقصد کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس کو بروئے کار لانے کی جدوجہد باہمی تعاون کے ساتھ کریں۔ جو لوگ اس کے لیے اسباب و وسائل فراہم کرنے کے پوزیشن میں ہیں وہ اس کے لیے اسباب و وسائل فراہم کرنے میں ہاتھ بٹائیں اور جو لوگ اپنی ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے اس کو مدد پہنچا سکتے ہیں وہ اپنی ذہنی اور علمی صلاحیتیں اس کے لیے وقف کریں۔

فی الحال اس مقصد کے لیے عملی قدم یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ جدید اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے کچھ ایسے لوگوں کو جو دین سے دلچسپی اور مناسبت رکھتے ہوں آمادہ کیا جائے کہ وہ علم دین میں تبحر حاصل کر سکیں اور اس چیز کا ان کے لیے قابل اطمینان انتظام کیا جائے۔ اسی طرح دین کی کچھ اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے اشخاص کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ جدید علوم کے مختلف شعبوں میں سے کسی شعبہ میں دستگاہ حاصل کریں اور اس کے لیے ان کو ضروری اسباب و وسائل فراہم کیے جائیں۔ اس کام کے لیے جو لوگ بھی آگے بڑھیں وہ اس عزم اور اس عہد و پیمان کے ساتھ آگے بڑھیں کہ وہ اپنی زندگیاں اسلام کی خدمت کے لیے وقف کریں گے اور ان کے قلم اور زبان کی ساری کوششیں اسی راہ میں صرف ہوں گی۔

اس قسم کے تعلیمی و تربیتی ادارے الگ الگ تمام مسلمان ملکوں میں بھی قائم ہونے چاہئیں اور تمام مسلمان ممالک کے دینی خدمت گذاروں کے باہمی اشتراک و تعاون سے ایک طاقتور ادارہ، جس کی تحریک ڈاکٹر سعید رمضان صاحب نے کی ہے، یورپ کے کسی موزوں مقام پر بھی قائم ہونا چاہیے۔ (باقی ہے ۔۔۔ پر)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۵)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ
بِمُؤْمِنِيْنَ (۸) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج وَمَا يَخْدَعُوْنَ
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹) فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ لا فَزَادَهُمُ اللّٰهُ
مَرَضًا ج وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ لا بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۱۰) وَاِذَا
قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ لا قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (۱۱)
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (۱۲) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ط
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۱۳) وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا صلے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ لا قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۱۴) اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ

طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۵) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۶)

ترجمہ: اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ تھا تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پیدا کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں، کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ آگاہ رہو کہ بے وقوف یہی لوگ ہیں لیکن یہ جانتے نہیں۔ اور جب ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کی مجلسوں میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، ہم تو ان لوگوں سے محض مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیے جا رہا ہے، یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔

۱۳ - الفاظ کی تحقیق

من الناس | الناس کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس عام سے ایک خاص گروہ مراد ہے اور وہ گروہ ہے یہود کا۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ صرف یہود ہی ہو سکتے تھے جن کے اندر کوئی جماعت وہ روپ دھار سکتی تھی جس کی طرف قرآن نے ان آیات میں اشارہ کیا ہے۔ آگے مستقل عنوان سے اس اجمال کی وضاحت آئے گی۔

یخادعون اللہ | مخادعت کے معنی ہیں دھوکا دینے کی کوشش کرنا عام اس سے کہ وہ دھوکا کامیاب ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ یہاں مخادعت کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور خدع کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے، جہاں لفظ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے وہاں تو مخادعت استعمال ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی خواہش تو کوئی شخص اپنی حماقت کے سبب سے کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کو دھوکا دے نہیں سکتا۔ برعکس اس کے خود اُن کے لیے خدع کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ جو شخص خدا کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنی اس کوشش میں تو ناکام رہتا ہے لیکن خود اپنے آپ کو وہ ضرور دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔

وما یشعرون | شعور کا لفظ کسی محسوس چیز کے ادراک کے لیے آیا کرتا ہے۔ یہاں اس لفظ کا استعمال اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اگرچہ خدا کو دھوکا دینے کی کوشش میں خود دھوکا کھا جانا ایک محسوس ہونے والی چیز ہے لیکن یہ بد بخود غلط لوگ ہوشیاری و چالاکی کے زعم کے باوجود اتنے غبی ہیں کہ اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ابھی اس کا نتیجہ ان کے سامنے نہیں آیا ہے۔

فی قلوبھم مرض | مرض کا لفظ قرآن میں عموماً دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک کینہ اور حسد کے معنی میں۔ دوسرے نفاق کے معنی میں۔ جن مقامات میں یہ لفظ نفاق کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو یہ واضح طور پر کینہ اور حسد کے معنی میں ہے لیکن جن مقامات میں یہ تنہا استعمال ہوا ہے وہاں یا تو دونوں معانی اس کے اندر جمع ہیں یا قرینہ اس کے دونوں معانی میں سے کسی ایک معنی کو متعین کرتا ہے۔ یہاں واضح قرینہ اس بات کے لیے موجود ہے کہ اس سے مراد حسد ہے کیونکہ یہاں جس گروہ کا بیان ہے آگے چل کر واضح ہوگا کہ یہ یہودیوں کے اندر کا ایک گروہ ہے اور یہود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ پر ایمان لانے والوں سے جو حسد تھا وہ معلوم و مشہور ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔

فزادھم اللہ مرضا | یہاں حسد کے بڑھانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے تو یہ درحقیقت اس سنت کو اس نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کے تحت یہ فعل انجام پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے سینہ کو ایمان و اسلام کی جلوہ گاہ بنانے کے بجائے اس کو بغض و حسد ہی کی پرورش گاہ بنائے رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے اسی طرح کے حالات و واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو اس کی اسی بھری فصل کی آبیاری کرتے ہیں۔ یہود کو مسلمانوں پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کو اسلام کی نعمت کیوں دے دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور اس کی برکتوں کی روز افزوں ترقی نے ان کے اس حسد کے اسباب میں اور زیادہ اضافہ کیا اور یہ اضافہ برابر ہوتا ہی رہا یہاں تک کہ اس چیز نے ان کو بالکل تباہ کرکے چھوڑا۔

لاتفسدوا فی الارض افساد فی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظام حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی دعوت انبیائے کرام علیہم السلام لے کر آتے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جس طرح اس کائنات کا نظام تکوینی اس وجہ سے قائم ہے کہ اس کے اندر ایک ہی رب قدیر و قہار کا ارادہ کارفرما ہے، اگر اس کے اندر کسی اور کا زور و اختیار بھی چلتا ہوتا تو یہ آن کے آن میں درہم برہم ہو کے رہ جاتا اسی طرح اس کے نظام تشریعی کے اندر اگر کسی اور کی عبادت و اطاعت کے جواز یا دخل کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے اس کا مزاج بالکل ہی بگڑ کے رہ جاتا ہے اور یہ بگاڑ سارے نظام تمدن کو خراب کرکے رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ کوشش قرآن کے نزدیک فساد فی الارض کے حکم میں داخل ہے جو اس بگاڑ کا دروازہ کھولے اگرچہ یہ کوشش بظاہر اصلاح کے نیک ارادہ ہی کے ساتھ کیوں نہ کی جائے۔

کما آمن الناس یہاں الناس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

واذا خلوا الی شیاطینھم خلوا کے بعد الیٰ کا صلہ تقاضا کرتا ہے کہ یہاں کوئی فعل ایسا محذوف مانا جائے جو اس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

شیطان کا لفظ شاط یشیط سے فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی جلد باز، تندخو، مشتعل مزاج اور شریر و سرکش کے آتے ہیں۔ ان خصوصیات کے حامل جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ یہاں یہ لفظ یہود کے ان لیڈروں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو فساد فی الارض کے اس سارے کھیل کی رہنمائی کر رہے تھے۔

اللہ یستھزئ بھم و یمدھم فی طغیانھم مد کے معنی ڈھیل دینے اور کسی کی رسی دراز کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ان کی رسی دراز کرتا جا رہا ہے تاکہ جب ان کو پکڑے تو ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اپنے جس مذاق کا ذکر فرمایا ہے یمدھم فی طغیانھم کے الفاظ اسی کی وضاحت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ خوش تھے کہ مسلمانوں کو بیوقوف بنانے اور اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالانکہ صحیح راہ بتانے والے کو اپنے خیال کے مطابق جو شخص دھوکا دے کر ایک غلط راہ اختیار کرتا ہے وہ راہ بتانے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ وہ خود اپنے آپ کو آوارہ گردی کی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ اب یہ محض اس کی خود فریبی اور حماقت ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے راہ بتانے والے کو دھوکا دیا ہے۔ دھوکا تو درحقیقت اس نے خود کھایا ہے۔

اشتروا الضلالۃ اشتراء کے معنی خریدنے کے ہیں۔ آدمی جس چیز کو کوئی قیمت ادا کرکے خریدتا ہے اس کو اس شے کے مقابل میں جس کو وہ قیمت قرار دیتا ہے ترجیح دیتا ہے۔ یہیں سے اس لفظ کے اندر ترجیح دینے کا مفہوم پیدا ہو گیا اور اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

۱۳ - یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے؟

اوپر دو گروہوں کا ذکر ہوا۔ ایک ان لوگوں کا جو ایمان لائے دوسرے ان لوگوں کا جو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے بعد یہ ایک تیسرے گروہ کا بیان ہے جو تعلق تو رکھتا ہے ایمان نہ لانے والے گروہ سے لیکن اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان سے کچھ مختلف مزاج رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟ لوگوں نے عام طور پر یہ سمجھا ہے کہ یہ منافقین کا گروہ ہے۔ لیکن یہاں شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ منافقین کے لفظ سے جو گروہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ ظاہراً ہر پہلو سے اپنے آپ کو مسلمانوں کے اندر شامل رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس کو جو عداوت بھی وہ چھپی ہوئی تھی جو صرف خاص خاص مواقع ہی پر ظاہر ہوتی تھی لیکن اس گروہ کی جو خصوصیات قرآن نے بیان فرمائی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ تو باطناً مسلمانوں کے ساتھ تھے اور نہ زبانی ہی ان کے ساتھ اتفاق کے اظہار کے لیے آمادہ تھے۔ مثلاً یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کا اظہار زبان سے بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ علاوہ ازیں یہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بالاتر سمجھتے تھے چنانچہ جب ان سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ اگر ایمان کے مدعی ہو تو مسلمانوں کی طرح ایمان لاؤ تو کھلم کھلا مسلمانوں کو بے وقوف ٹھہراتے تھے

سمجھتے ہوئے اس سے گریز کی راہ تلاش کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ساتھ چالبازی کرتا ہے خواہ وہ اپنے اس فعل کے اس مکروہ پہلو کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔

پھر یہ حقیقت بھی واضح فرمادی کہ وہ کوشش تو کر رہے ہیں اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص چالبازی کرکے اپنے کسی ناصح مشفق کے مشورہ کو ٹھکراتا ہے وہ اس ناصح مشفق کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ وہ اپنے آپ ہی کو کسی کھڈ میں گراتا ہے۔ فرض کیجیے ایک حاذق اور خیر خواہ طبیب کسی مریض کے لیے ایک نسخہ لکھتا ہے مریض اس نسخہ کو تو استعمال نہیں کرتا، البتہ طبیب کو مختلف حیلوں حوالوں سے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس سے بہتر نسخہ استعمال کر رہا ہے اور وہ تمام تندرستوں سے زیادہ تندرست ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طبیب اس کی جھوٹی قسموں اور اس کی ہیر پھیر کی باتوں سے خاموش ہو جائے لیکن اس دھوکہ بازی کا خمیازہ کس کے سامنے آئے گا، طبیب کے سامنے یا مریض کے سامنے ؟ ظاہر ہے کہ مریض ہی کے سامنے۔ اب یہ محض اس کی اپنی بے عقلی ہوگی اگر وہ اس امر واقعی کا احساس نہ کرے۔

اس کے بعد قرآن نے یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ ایک حقیقت کا جرأت کے ساتھ استقبال کرنے کے بجائے انھوں نے جھوٹ اور فریب کی یہ روش جو اختیار کی ہے اس کا سبب ان کا وہ حسد ہے جو بنی اسمٰعیل کے خلاف وہ رکھتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کے اندر اپنا آخری نبیؐ مبعوث فرمایا؟ اس پر اپنی کتاب اتاری، اس نبی کی دعوت پھیلنے لگی اور اس بات کے آثار صاف نظر آنے لگے کہ اب دنیا کی دینی رہنمائی کی باگ بنی اسرائیل کے ہاتھوں سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے ہاتھوں میں جا رہی ہے تو یہ غصہ اور حسد سے کھولنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انعام ان پر کیوں فرمایا اس کے حقدار تو ہم تھے اور جتنا ہی بنی اسمٰعیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بڑھتے گئے اتنا ہی ان کے حسد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

ان لوگوں کے اندر حق پسندی اور اخلاقی جرأت ہوتی تو یہ خود اس حق کا ساتھ دے کر اللہ تعالیٰ کے اس انعام میں حصہ دار بن سکتے تھے لیکن یہ لوگ نہ تو دینی پیشوائی کے موروثی پندار سے دستبردار ہونے کے لیے تیار تھے، نہ اپنے حسد کے سبب سے اس بات کے لیے تیار ہوئے کہ بنی اسمٰعیل کے اندر پیدا ہونے والے نبی پر ایمان لائیں اور نہ یہی جرأت رکھتے تھے کہ خم ٹھونک کر میدان میں آئیں اور اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکیں۔ جب ان باتوں میں سے کسی بات کی بھی ہمت وہ نہ کر سکے تو واحد راہ جو

ان کے لیے باقی رہ گئی تھی وہ یہی تھی کہ جھوٹ اور فریب کے دامن میں پناہ لیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو خبردار کیا کہ یہ انھوں نے بہت ہی غلط پناہ گاہ تلاش کی ہے اگر اس پناہ گاہ کے اندر انھوں نے چھپنے کی کوشش کی تو دنیا میں حسد کی آگ میں جلتے رہیں گے اور آخرت میں اس کا انجام دردناک عذاب ہے۔

دوسری چیز جو خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی جو مخالفت کر رہے تھے قرآن نے اس کو زمین میں فساد برپا کرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ درحقیقت کسی فعل کو اس کے آخری نتائج سے تعبیر کرنے کا ایک معروف اسلوب ہے جو قرآن میں بہت سے مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے سامنے اس کے کسی فعل کا آخری نتیجہ آجاتا ہے۔ یہ چیز کسی فعل سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے اگر فعل برا ہو اور اس پر ابھارنے میں بھی مددگار ہوتی ہے۔ اگر فعل اچھا ہو۔ بات جو ان لوگوں سے کہنی تھی وہ تو یہی تھی کہ دین حق کی دعوت میں روک نہ بنیں لیکن محض اتنی بات کہنے سے ان کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی اس روش سے اس دنیا کی تباہی و بربادی میں کس درجہ کا حصہ لے رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس روش کا وہ انجام ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے جو سامنے آسکتا ہے اگر خدانخواستہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہو جائیں۔

رہا اس زمین کا صلاح و فساد تو اس کا انحصار، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، صرف اس چیز پر ہے کہ اس کے اندر کس کا حکم اور کس کا قانون چلتا ہے۔ اس کے حقیقی خالق و مالک کا، یا کسی اور کا۔ اگر اس کے خالق و مالک کا حکم چلتا ہے تو اس سے اس زمین پر امن و عدل کا صحیح نظام قائم ہوگا اور اس کی وہ تمام برکتیں ظہور میں آئیں گی جو اس کے اندر ودیعت ہیں۔ اور اگر صورت اس کے برعکس ہو تو اس کے ہر گوشہ میں فساد رونما ہوگا اگرچہ اس فساد کو تہذیب اور تمدن کے کتنے ہی خوشنما ناموں سے موسوم کر دیا جائے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ اس زمین میں خدا کا قانون جاری کرنا چاہتے ہیں اس وجہ سے ان کی جدوجہد اس زمین کی اصلاح کی حقیقی جدوجہد ہوتی ہے اور اس کی مخالفت کی راہ میں ہر قدم فساد کا قدم ہے خواہ وہ بظاہر کتنے ہی نیک ارادہ کے ساتھ اٹھایا جائے۔ اسلام کے یہ مخالفین اپنی اس مخالفت کے لیے وجہ جواز یہ پیش کرتے تھے کہ ایک نئی نبوت کے ظہور اور خاص کر اس کے اس دعوے کے

سبب سے کہ خدا کا حقیقی دین دبا ہے جس کو اس نے پیش کیا ہے، اس ملک میں سخت انتشار پیدا ہو رہا ہے اس وجہ سے یہ جو اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں یا اس سے لوگوں کو روک رہے ہیں تو اس ملک میں فساد نہیں مچا رہے ہیں بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ فساد تو ان کے خیال میں وہ لوگ برپا کر رہے تھے جنھوں نے یہ نئی دعوت بلند کی تھی یا اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ قرآن مجید نے اس کا جواب یہ دیا کہ فساد برپا کرنے والے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں لیکن ان کو اپنے فساد کا احساس نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی خودغرضی اور تنگ نظری کے سبب سے اس حقیقت کو سمجھ نہیں رہے ہیں کہ اس دنیا کی اصلاح اس طرح نہیں ہو سکتی کہ حق اور باطل کفر اور اسلام دونوں کو ملا کر رکھا جائے، بلکہ اس کی اصلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اس کی پیروی کی جائے۔ ان لوگوں کا پہلا جرم تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم گم کی اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ اس کو ازسرِنو دنیا کے لیے کھول رہا ہے تو ان مفسدین کی کوشش یہ ہے کہ لوگ اس صراط مستقیم کو اختیار کرنے کے بجائے اپنی اپنی پسندکردہ پگڈنڈیوں ہی پر بھٹکتے رہیں اور اس حماقت کو یہ لوگ اصلاح سمجھتے ہیں حالانکہ یہ عین افساد ہے۔

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے اس دعوائے ایمان اور اس مظاہرۂ رواداری کے پس پردہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تحقیر کا جو خبث چھپا ہوا تھا قرآن نے نہایت خوبی کے ساتھ اس سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے تاکہ ان کی دھوکہ بازی کے سبب سے اگر کسی مسلمان کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہو کہ یہ لوگ دوسروں کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے کچھ فراخ دل ہیں تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ یہ پردہ قرآن نے اس طرح اٹھایا ہے کہ ان کا یہ راز فاش کر دیا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں پر تو اپنے مومن ہونے کی دھونس جماتے ہیں تاکہ مسلمان ان کو اپنے سے کچھ مختلف نہ سمجھیں لیکن دوسری طرف ان کے خبث باطن کا یہ حال ہے کہ اگر ان سے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ اگر آپ لوگ ایمان کے مدعی ہیں تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح قرآن پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کیوں نہیں لاتے تو یہ بات سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کیا ہم ان ناسمجھ اور احمق لوگوں کی طرح سرایسے پھرے کو نبی مان لیں اور اس کے پیچھے لگ جائیں؟

قرآن مجید نے ان کی اس بات کا جواب یہ دیا کہ بیوقوف اور احمق تو درحقیقت یہی لوگ ہیں لیکن

چونکہ ابھی ان کی اس بےوقوفی کا انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے اس وجہ سے موقع ہے کہ یہ کچھ دنوں یہ دانش فروشی اور کر لیں۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کا یہ راز بھی یہاں کھول دیا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے پاس جب آتے ہیں تو اُن پر یہ اثر جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا ان کے اور مسلمانوں کے درمیان سرے سے کوئی تفاوت ہے ہی نہیں لیکن جب یہ اپنی مجلسوں میں جاتے ہیں اور اپنے لیڈروں سے ملتے ہیں تو وہاں مسلمانوں کے سامنے اپنی کہی ہوئی باتوں کی صفائی پیش کرتے ہیں اور ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم تو بدستور آپ کے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں سے جو باتیں ہم کہتے ہیں وہ تو محض ان کو بیوقوف بنانے کے لیے بطور مذاق کہتے ہیں۔

قرآن مجید نے ان کی اس بات کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ تو سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں حالانکہ مذاق ان کے ساتھ قدرت کر رہی ہے جو ان کی اس سرکشی کے باوجود ان کو ڈھیل پر ڈھیل دیتے جا رہی ہے وہ اپنی چالوں میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہوئے آگے بڑھے جا رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ان کا یہ آگے بڑھنا اس ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے آگے بڑھنا ہے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے خدا کی طرف سے مقدر ہے لیکن انھیں نظر نہیں آ رہا ہے۔

اس سلسلہ کی آخری بات جو فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ عقل و دانش کے اس ادعا کے باوجود انھوں نے سودا بہت غلط کیا۔ انھوں نے ہدایت کے بدلہ میں ضلالت خریدی اور اس کو بڑا نفع بخش مال سمجھا لیکن یہ مال ان کے لیے نہ آخرت میں نفع بخشنے والا ہے نہ دنیا میں۔ آخرت میں تو اس کی قدروقیمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہونا تھا لیکن دنیا کے بازار میں بھی گمراہی کی مانگ تھی تو نبی آخرالزماں کی بعثت سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور اب یہ لوگ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہیں۔ ان کی یہی ضلالت پسندی ان کے اسلام سے محرومی کا سبب بھی بنی ہے۔ (باقی آئندہ)

امام الہند مولانا آزاد کی یاد میں شائع ہونے والا واحد ہفت روزہ
الہلال اور البلاغ کی عظیم روایات کا آئینہ دار
"الکلام" پٹنہ
ہر پنجشنبہ کو پوری پابندی سے شائع ہوتا ہے
قیمت فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے۔ سالانہ چندہ ۱۲ روپے
منیجر الکلام پٹنہ ۴

بحث ونظر

امین احسن اصلاحی

خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

اور

اسلام کا اُصولِ مساوات

(۲)

اب ہم مختصر طور پر ان اعتراضات کا جائزہ لیں گے جو ہمارے پیش کردہ نقطۂ نظر پر ایک محترم بزرگ کی طرف سے کیے گئے ہیں۔ یہ اعتراضات مندرجہ ذیل ہیں:-

ایک یہ کہ کسی معاملہ میں ایک حکم دینے اور کسی قضیہ کا فیصلہ کر دینے میں آخر وہ کیا باریک فرق ہے جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ یہ امر نہ تھا، بلکہ ایک قضیے کا فیصلہ تھا۔ پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ حضورؐ نے خواہ انصار پر قریش کے حق خلافت کو ترجیح دی ہو یا تمام عرب پر، اس سے نفس مسئلہ زیر بحث پر آخر کیا اثر پڑتا ہے؟

دوسرا یہ کہ تاریخ میں اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ حضورؐ کے حین حیات انصار اور مہاجرین کے درمیان خلافت کے متعلق کوئی قضیہ پایا جاتا تھا۔

تیسرا یہ کہ آخر کسی شخص کو یہ علم کس طرح ہوگیا کہ حضورؐ نے قریش کے بارے میں جو کچھ فرمایا اس سے مقصود دراصل کسی قضیہ کا فیصلہ تھا۔ کیا حضورؐ نے خود اس کی صراحت فرمائی تھی یا آپ کے اقوال کے متعلقات میں کوئی قرینہ ایسا پایا جاتا ہے جس سے یہ منشا مترشح ہوتا ہو؟

چوتھا یہ کہ فلاں اور فلاں علما نے اس امر پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے کہ کوئی غیر قرشی مسلمانوں کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ یہ تمام اعتراضات، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بالکل سرسری و سطحی ہیں لیکن ممکن ہے کہ ان سے کسی شخص کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا ہوئی ہو اس وجہ سے بالاجمال ہم ان کو بھی صاف کیے دیتے ہیں تاکہ کسی صاحب کے لیے بھی کوئی عذر کم از کم عنداللہ باقی نہ رہے۔

اعتراضات کے جواب جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے اس کے جواب میں گذارش ہے کہ کوئی مستقل حکم دینے اور کسی قضیہ کا وقتی فیصلہ کرنے میں فی الواقع فرق ہے اور وہ فرق ذرا باریک ہے اس وجہ سے اس کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے اور سمجھانے کی بھی۔ وہ فرق یہ ہے کہ کسی نزاع کا جو فیصلہ ہوا کرتا ہے اس کا تعلق صرف متعلق پارٹیوں سے ہوا کرتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آیا کرتا کہ اگر اسی حق کے لیے کوئی تیسرا فریق اس سے بہتر وجوہ استحقاق کے ساتھ سامنے آئے جو وجوہ ایک فریق کی دوسرے پر ترجیح کا باعث ہوئے ہیں جب بھی اسی کو ترجیح حاصل رہے گی۔ اگر حضورؐ کا یہ ارشاد کہ خلفا قریش میں سے ہوں ایک مستقل حکم ہے تب تو صحیح بات یہی ہے کہ کسی اسلامی حکومت کا جائز حکمران کوئی غیر قرشی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر تو ہر اسلامی حکومت میں خلافت کے منصب کے لیے کسی قرشی کا تلاش کرنا ضروری ہوگا۔ اگر اس حکومت میں کوئی قرشی موجود نہیں ہوگا تو باہر سے اگر کسی ملک میں موجود ہوگا، کوئی قرشی مہیا کرنا پڑے گا۔ یہاں تک کہ اگر ہمارے ان بزرگوں کو پاکستان میں بھی اپنے تصور کے مطابق کبھی حکومت بنانے کا موقع ملا تو اس حدیث کے بموجب ان پر فرض ہوگا کہ جہاں تک تخت خلافت کا تعلق ہے اس کو سنبھالنے کی زحمت کسی قرشی صاحب یا کسی سید صاحب ہی کو دیں۔ اگر انھوں نے اس کی خلاف ورزی کی تو یہ بات ان کے اپنے بیان کے مطابق امت کے اس اجماع کے خلاف ہوگی جس کے خلاف کرنے کی جسارت خوارج اور معتزلہ کے سوا کسی نے بھی نہیں کی ہے۔

اور اگر یہ ایک قضیہ کا فیصلہ ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ خلافت کے معاملہ میں انصار کے مقابل میں قریش کو ترجیح حاصل تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قریش ہی کو یہ ترجیح دنیا کے ہر گروہ کے مقابل میں ہمیشہ کے لیے حاصل ہے خواہ وہ وجوہ ترجیح کے لحاظ سے ان سے زیادہ حق دار ہو۔

نفس مسئلہ زیر بحث پر اس کا اثر یہ پڑے گا کہ ترجیح کا پہلو متعین ہوکر سامنے آجائے گا۔ وہ

اس طرح کہ یہ دیکھا جائے گا کہ نزاع کس امر میں تھی اور کن وجوہ کی بنیاد پر تھی اور فیصلہ کس کے حق میں ہوا۔ اگر قضیہ کی روداد سے یہ ثابت ہوگا کہ انصار اور مہاجرین میں اختلاف خلافت کے لیے تھا اور بنائے اختلاف نسب وحسب تھا اور پھر یہ معلوم ہوگا کہ حضورؐ نے فیصلہ قریش کے حق میں دیا تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ خلافت کے معاملہ میں اصلی فیصلہ کن عامل درحقیقت حسب ونسب ہے اور اس اعتبار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بموجب قریش کو انصار پر ترجیح حاصل ہے۔ اور اگر معاملہ کی روداد سے یہ واضح ہوگا کہ اختلاف خلافت کے لیے تھا اور بنائے اختلاف یہ چیز تھی کہ انصار اپنی دینی واسلامی خدمات اور اپنی سیاسی قوت وشوکت کے اعتبار سے اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتے تھے اور قریش اپنی دینی واسلامی خدمات اور اپنی سیاسی جمعیت وعصبیت کی بنا پر اپنے آپ کو اس کا حقدار خیال کرتے تھے اور حضورؐ نے فیصلہ قریش کے حق میں دیا تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ اسلام میں خلافت وامارت کا استحقاق اس پارٹی کو حاصل ہوتا ہے جس کو اپنی دینی واسلامی خدمات اور اپنے سیاسی اثر ورسوخ کے اعتبار سے ملک کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔ اس چیز میں حسب ونسب اور خاندانوں کے امتیازات کو کوئی دخل نہیں ہے۔

اب ہر شخص خود غور کرکے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ حضورؐ کے ارشاد کو ایک مستقل امر وحکم ماننے اور ایک نزاع یا قضیہ کا فیصلہ ماننے میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے یا نہیں واقع ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرے اعتراض کے جواب میں کئی گذارشیں ہیں۔

پہلی گذارش یہ ہے کہ جن محترم بزرگ کو انصار اور مہاجرین کے درمیان کسی قضیہ کے وجود کی تاریخ میں کوئی شہادت ہی نہیں مل سکی، وہی بزرگ "قریش کی برادری" کو انصار پر ترجیح دینے کا فلسفہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاں قبائلیت اور برادریوں کے تعصبات یا دوسری گروہی عصبیتیں زندہ ومتحرک ہوں وہاں ان سے براہ راست تصادم کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ جہاں جس قبیلے یا برادری یا گروہ کا زور ہو وہاں اسی کے نیک لوگوں کو آگے لانا چاہیے تاکہ زورآور گروہ کی طاقت اسلامی نظام کے نفاذ کی مزاحم بننے کے بجائے اس کی مددگار بنائی جاسکے۔"

سوال یہ ہے کہ یہ کس سرزمین کا ماجرا بیان ہو رہا ہے۔ عرب ہی کا یا کسی اور خطۂ زمین کا؟ اگر یہ جزیرۃ العرب کا

حال بیان ہو رہا ہے کہ وہاں قبائلیت اور برادریوں کے تعصبات اور گروہی عصبیتیں زندہ تھیں اس وجہ سے حکمت عملی کا تقاضا یہ ہوا کہ قریش کی زوردار برادری ہی کو زمام خلافت سونپی جائے تو ارشاد ہو کہ قریش کی زورآور برادری کے مقابل میں انصار کے سوا اور کون تھا جو سامنے آنے کی جرأت کرسکتا تھا۔ لازماً یہ صورت حال جو بیان کی گئی ہے وہ انصار اور قریش ہی کی صورت حال ہوسکتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ تاریخ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان کسی قضیہ کی موجودگی کی شہادت کیوں نہیں ملی؟ کیا اس عہد کے حالات پر یہ تبصرہ تاریخ کی کسی شہادت کے بغیر محض اٹکل پچو ہی کرڈالا گیا ہے؟ پھر ان سطروں میں جو دلیل قریش کے استحقاق خلافت کی دی گئی ہے وہ تو ان کا زور واثر ہے نہ کہ ان کا نسب خاندان۔ اور زور واثر ایسی چیز ہے جس کی بنا پر اگر ان کو انصار پر ترجیح دی گئی تو یہ بات اسلام کے تمام اصولوں کے بالکل مطابق ہوئی۔ اس سے اسلام کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا اصول بھی مجروح نہیں ہوا۔ پھر اس سے اس حکمت عملی کا ثبوت کدھر سے برآمد ہوا جس کے برآمد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے کسی اصول کو توڑ کر برآمد ہو؟

دوسری گذارش یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان کسی قضیہ کے موجود ہونے کے لیے یہی لازم نہیں ہے کہ یہ قضیہ براہ راست خلافت ہی کے لیے ہو۔ خلافت کا سوال تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی اُٹھ سکتا تھا۔ قضیہ کے موجود ہونے کے لیے تنہا یہ چیز کافی ہے کہ انصار زور واثر اور خدمت دین میں اپنے آپ کو قریش کے ہم رتبہ خیال کرتے رہے ہوں اور اس خیال کے سبب سے ان کے اندر فی الجملہ مسابقت اور مقابلہ کی اسپرٹ پائی جاتی رہی ہو۔ سو یہ واقعہ ہے کہ انصار کم از کم اپنے مرکز یعنی مدینہ میں اپنے آپ کو بڑی طاقت سمجھتے تھے اور ان کا یہ سمجھنا بیجا نہیں تھا۔ پھر اسلام کو سربلند کرنے کے لیے انھوں نے جو عظیم خدمات انجام دی تھیں ان کی بنا پر وہ ہر میدان میں اپنے آپ کو مہاجرین کا مدمقابل سمجھتے تھے۔ ان کا یہ احساس اس قدر نمایاں تھا کہ جو شخص اس عہد کی تاریخ پر نگاہ رکھتا ہے وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا[1]۔ ان کے اسی احساس سے کبھی کبھی منافقین غلط فائدے

[1] سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے لیڈر سعد بن عبادہ کی ایک تقریر ملاحظہ فرمایئے:۔

یا معشر الانصار ان لکم سابقة فی الدین، وفضیلة فی الاسلام لیست لقبیلة من العرب۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبث فی قومه بضع عشرة

(اگلے صفحہ پر دیکھیں)

بھی اٹھا لیتے تھے۔ چنانچہ تاریخوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بعض جذبات انگیز مواقع پر منافقین نے انصار اور مہاجرین کے جذبات ایک دوسرے کے خلاف اس طرح بھڑکا دیے ہیں کہ دونوں پارٹیوں کے لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں تک سونت لی ہیں اور حالات اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ

(بقیہ) سنة يدعوهم الى عبادة الرحمن وخلع الاوثان فما آمن به من قومه الا قليل. والله ما كانوا يقدرون ان يمنعوا رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا يعزوا دينه ولا يدفعوا عن انفسهم. حتى اراد الله لكم الفضيلة وساق اليكم الكرامة وخصكم بالنعمة ورزقكم الايمان به وبرسوله صلى الله عليه وسلم والمنع له ولاصحابه والاعزاز لدينه والجهاد لاعدائه. فكنتم اشد الناس على من تخلف عنه منكم واثقله على عدوكم من غيركم حتى استقاموا لامر الله تعالى طوعا وكرها واعطى البعيد المقادة صاغرا داخرا حتى اثخن الله تعالى لنبيه بكم الارض ودانت باسيافكم له العرب وتوفاه الله تعالى وهو راض عنكم قرير العين فشدوا ايديكم بهذا الامر فانكم احق الناس واولاهم به فاجابوه جميعا ان قد وفقت فى الرأى واصبت فى القول. (الامامة والسياسة ابن قتيبة)

اے گروہ انصار! خدمت اسلام میں جو افضلیت و اولیت تم کو حاصل ہے عرب کے کسی قبیلہ کو بھی حاصل نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو برسوں خدائے واحد کی پرستش اور شرک سے باز آنے کی دعوت دیتے رہے لیکن آپ کی قوم میں سے صرف تھوڑے ہی سے لوگ ایمان لائے۔ ان تھوڑے سے لوگوں کا بھی حال یہ تھا کہ خدا کی قسم یہ لوگ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر سکتے تھے، نہ آپ کے دین کی تبلیغ کر سکتے تھے اور نہ خود اپنی ہی جانوں کی حفاظت کر سکتے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس شرف سے نوازا اور اس نعمت سے سرفراز کیا اور تمہیں اس بات کی توفیق حاصل ہوئی کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، رسول اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت کرو اور دین کو سربلند کرو اور دشمنان دین سے جہاد کرو۔ اس کے بعد دین سے منحرف رہنے والوں پر سب سے زیادہ سخت تم رہے ہو، عام اس سے کہ یہ تمہارے اندر کے لوگوں میں سے یا باہر کے لوگوں میں سے، یہاں تک کہ خدا کے حکم کے آگے طوعاً یا کرہاً سب جھک جانا پڑا۔ دور والوں کو بھی اطاعت کرنی پڑی۔ اللہ نے تمہارے ذریعہ سے اپنے نبی کے لیے زمین کو مفتوح کر دیا اور تمہاری تلواروں کے ذریعہ سے عرب کو مطیع بنا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے تشریف لے گئے تو وہ تم سے خوش تھے۔ (اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا ہے۔ مثلاً وہ واقعہ جو غزوہ مریسیع کے موقعہ پر پیش آیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ بھی کوئی اتفاقیہ طور پر نہیں پیش آ گیا تھا بلکہ اس کے لیے بھی ایک سے زیادہ اسباب و محرکات پہلے سے موجود تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس فتنہ کے بھڑکانے میں بھی زیادہ ہاتھ منافقین ہی کا تھا لیکن جب تک بھڑکنے کے لیے کچھ مادہ موجود نہ ہو اس وقت تک مجرد کسی کی دیاسلائی کیا کام کر سکتی ہے؟ ان تمام حالات کا سب سے زیادہ اندازہ اگر کسی کو ہو سکتا تھا تو وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہو سکتا تھا اور حضور ہی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر ان خطرات کا سدباب بھی فرما سکتے تھے جن کے اس صورت حال سے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس وجہ سے یہ بات بالکل معقول اور قرین قیاس ہے کہ حضورؐ نے اپنی حیات مبارک ہی میں اس قضیہ کی موجودگی کو محسوس فرما لیا اور اس کے بارے میں ایک ایسا فیصلہ دے دیا جس سے اس فتنہ کو دبانے میں بڑی مدد ملی جو حضورؐ کی وفات کے معاً بعد منافقین نے اٹھا دیا تھا۔

تیسری گزارش یہ ہے کہ یہ خیال کرنا کچھ صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کے اندر حضورؐ کی حیات مبارک میں نہ آپ کی وفات کا کوئی تصور پایا جاتا تھا اور نہ آپ کے بعد آپ کی خلافت کا۔ اس طرح کا خیال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور اس عہد کے مسلمانوں کی ذہانت سے متعلق انتہائی بدگمانی کے مترادف ہے۔ اگر حضورؐ اس طرح کے معاملات میں امت کو اندھیرے میں چھوڑ گئے ہوتے تو لوگ پہلے ہی روز سے نہ معلوم کیا کیا فتنے اٹھا دیتے اور وہ بات بالکل غلط ہو کے رہ جاتی جو اس ملت کے بارے میں فرمائی گئی ہے کہ اس کی شب بھی اس کے دن کے مانند روشن ہے۔ اس زمانہ کے ہر مسلمان کو پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم تھی کہ حضورؐ ایک دن وفات پانے والے ہیں اور آپ کی وفات کے بعد اس امت میں خلافت قائم ہونے والی ہے جس کے اصول یہ یہ ہوں گے، جس کے ہر دور فلاں فلاں قسم کے آئیں گے، جس کا آغاز اس قسم کا ہوگا، جس کے وسط کی یہ خصوصیات ہوں گی

(حاشیہ) اس وجہ سے اس خلافت کے سب سے زیادہ حقدار تم ہو۔ اس کو مضبوط ہاتھوں سے پکڑو۔ تمام انصار نے سعد کی اس رائے سے اتفاق کیا۔ ——— کیا کوئی شخص یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ انصار کے اندر یہ احساسات بالکل دفعتۃً کے وقت ابھر آئے تھے، پہلے سے ان کا کوئی نام و نشان موجود نہیں تھا اور اگر یہ احساسات موجود تھے تو کیا ان کی موجودگی اس بات کی مقتضی نہ تھی کہ حضورؐ اس بارے میں کوئی ایسی رہنمائی دے کے جاتے جو اس نزاع کے [illegible] میں مددگار ہو سکتی!

اور اس کے دَورِ آخر میں یہ فتنے نمودار ہوں گے۔ یہ ساری باتیں نہایت تفصیل کے ساتھ احادیث میں موجود ہیں۔ آخر یہ ساری حدیثیں صحابہؓ ہی کے ذریعہ سے لوگوں کو پہنچی ہیں۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر وہ ایک ایسے معاملہ پر غور کیوں نہ کرتے رہے ہوں گے جس کا تعلق براہِ راست خود ان کی اپنی زندگیوں سے تھا اور جس پر غور کرنا اور جس کے بارے میں رائے قائم کرنا اسلام میں کوئی گناہ کا کام بھی نہیں تھا۔ اگر غیر ضروری طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں وہ ساری حدیثیں نقل کر دیتے جو اس باب خاص میں وارد ہیں۔ اور وہ شبہات بھی بیان کر دیتے جو مستقبل سے متعلق انصار کے ایک طبقہ کے ذہنوں میں پائے جاتے تھے۔

تیسرے اعتراض کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ جہاں تک حدیث الائمۃ من قریش کا تعلق ہے اس کے الفاظ تو واضح طور پر نہ یہ بتاتے کہ یہ امر ہے، نہ یہ بتاتے کہ یہ خبر ہے، نہ یہ بتاتے کہ یہ کسی قضیہ کا فیصلہ ہے اور نہ ہی یہ بتاتے کہ یہ حکمت عملی کے تحت اسلام کے اصول مساوات کو توڑ کر قریش کو بربنائے نسب تمام عرب و عجم پر ترجیح دینے کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ مجرد اس حدیث کے الفاظ ان مفہوموں میں سے کسی مفہوم کو بھی قطعی طور پر متعین کرنے والے نہیں ہیں اس وجہ سے اہلِ فن کے عام طریقے کے مطابق اس حدیث کی تاویل کی جائے گی۔

تاویل کے معاملہ میں اہلِ تاویل کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی آیت یا حدیث کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ اسلام کے دوسرے واضح اور قطعی احکام سے کسی تصادم کے بغیر اس کا مدعا متعین ہو جائے اور قرائن و حالات سے اس مدعا کی تائید و تصدیق ہو جائے۔

اب آیئے دیکھیے کہ ہم نے جو اس حدیث کو انصار و قریش کے مابین ایک قضیہ کے فیصلہ کے مفہوم میں لیا ہے اور نسب و خاندان کے بجائے قریش کی دینی خدمات اور پورے عرب پر ان کی دھاک کو انصار کے مقابل میں ان کی ترجیح کا سبب قرار دیا ہے تو اس کے وجوہ کیا ہیں؟

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، مسابقت اور مقابلہ کی ایک اسپرٹ موجود تھی جس سے منافقین کبھی کبھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اس وجہ سے یہ اندیشہ بعید نہیں تھا کہ اس اسپرٹ سے منافقین حضورؐ کی وفات کے بعد خلافت کے معاملہ میں فائدہ اٹھانے کی کوشش

کریں۔ یہ اندیشہ متقضی ہوا کہ حضورؐ اس بارے میں کوئی واضح فیصلہ دے دیں تاکہ اگر کوئی فتنہ سر اٹھائے تو اس کا موثر طریقہ پر مداوا ہو سکے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے مقابلہ کا اگر کوئی اندیشہ ہو سکتا تھا تو صرف انصار ہی کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ اس زمانہ میں پورے عرب میں انصار کے سوا کوئی جماعت ایسی نہیں تھی جو اپنی اسلامی خدمات اور اپنی سیاسی جمعیت کے لحاظ سے یہ درجہ رکھتی ہو کہ قریش کی ہمسری کا حوصلہ کر سکے اس وجہ سے دوسرے نہ اس قضیہ میں کوئی پارٹی بننے کا دم داعیہ ہی رکھتے تھے، اور نہ ان سے اس فیصلہ کے تعلق کی کوئی اور وجہ موجود تھی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اسلام میں کوئی گروہ اپنی مذہبی خدمات اور اکثریت کے اعتماد کے حامل ہونے کی بنا پر تو یہ حق رکھتا ہے کہ حکومت و خلافت کے معاملہ میں اس کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہو لیکن کسی خاص قبیلہ یا برادری سے ہونے کی بنا پر اسلام میں کسی کو کسی پر کسی ادنیٰ سے ادنیٰ معاملہ میں بھی کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اے لوگو! ہم نے تم کو جو خاندانوں اور گروہوں میں تقسیم کیا ہے تو یہ محض اس لیے کہ یہ چیز تمہارے لیے شناخت اور تعارف کا ذریعہ بنے، اللہ کے نزدیک عزت والا تم میں سے وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔ اسی طرح حدیث میں وارد ہے کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر دین اور تقویٰ کے پہلو سے۔ قرآن اور حدیث کے ان نصوص کے ہوتے ہوئے الائمۃ من قریش کے یہ معنی لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس ترجیح میں کوئی دخل قریش کی قرشیت کو بھی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق بات یہی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ نے ان کو یہ ترجیح ان کو ان کی دینی خدمات اور ان کے اس عام اعتماد و رسوخ کی بنا پر دی ہو جو پورے عرب میں ان کو اس وقت حاصل تھا۔ یہاں تک کہ انصار بھی اس چیز میں ان کے مد مقابل نہیں ہو سکتے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کے الفاظ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس ترجیح کا سوال درحقیقت انصار کے مقابل ہی میں پیدا ہوا تھا اور وجہ ترجیح قریش کی نسبی برتری نہیں تھی بلکہ ان کا وہ رسوخ و اعتماد تھا جو پورے عرب میں ان کو حاصل تھا۔ چند روایات ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابوبکرؓ انصار کے لیڈر سعد کو قائل کرنے کے لیے فرماتے ہیں:

لقد علمت یا سعد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال وانت قاعد قریش ولاۃ ھذا الامر خیر الناس تبع لبرھم و فاجرھم تبع لفاجرھم فقال سعد صدقت

اے سعد تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے سامنے یہ بات فرمائی تھی کہ اس خلافت کے حامل قریش کو ہونا چاہیے۔ کیونکہ عرب کے اخیار ان کے اخیار کے پیرو رہے ہیں اور ان کے اشرار ان کے اشرار کے۔

انہی حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد ہے:

ولم تعرف العرب ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش

اہل عرب قریش کے سوا اور کسی کی قیادت سے آشنا نہیں ہیں۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے:

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس تبع لقریش صالحھم تبع لصالحھم و شرارھم تبع لشرارھم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اہل عرب قریش کے تابع ہیں، اُن کے نیک ان کے نیکوں کے اور ان کے بد ان کے بدوں کے۔

بعینہٖ یہی مضمون مختلف روایات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ اس بیان کا موقع و محل اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اگر کسی جماعت کے اندر یہ خیال پایا جاتا ہو کہ آنحضورؐ کے بعد خلافت کی ذمہ داریوں کی حامل وہ بھی ہو سکتی ہے تو اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اس بوجھ کے اٹھانے کے اس وقت صحیح اہل صرف قریش ہی ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اہل عرب کا اعتماد انہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ غور کیجیے کہ اس زمانہ میں اس کلام کا اصلی مخاطب انصار کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟ اور پھر اس امر پر غور کیجیے کہ قریش کی ترجیح کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس میں ان کے نسب اور برادری کا حوالہ ہے یا اس بات کا حوالہ ہے کہ جس طرح ان کو جاہلیت میں اہل عرب کا اعتماد حاصل رہا ہے اسی طرح اسلام میں بھی ان کو اہل عرب کا اعتماد حاصل ہے اس وجہ سے خلافت کے حقدار وہی ہیں جس طرح جمہوری نظاموں میں ملک کی اکثریت کا اعتماد رکھنے والی پارٹی کو حکومت بنانے کا حقدار سمجھا جاتا ہے اسی طرح قریش کو ان کی دینی خدمات اور ان کے عام معتمد علیہ ہونے کی بنا پر حامل خلافت ہونے کا حقدار قرار دیا گیا۔ یہ ایک بالکل واضح اور بالکل غیر مبہم حقیقت ہے جس میں شبہ کی کوئی گنجائش

نہیں ہے۔ لیکن حکمت عملی کے تحت دین میں رد و بدل کے اصول کو ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ترجیح کی ٹانگ قریش کے نسب اور ان کی برادری کے ساتھ باندھی جائے تاکہ کہا جا سکے کہ دیکھو! اسلام اگرچہ ذات برادری کے امتیازات کا دشمن ہے، قرآن و حدیث میں مساوات کا حکم دیا گیا ہے، لیکن چونکہ عملی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ خاص خلافت کے معاملہ میں مساوات کے اصول کو توڑ دیا جائے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں مساوات کے اصول کو نعوذ باللہ توڑ دیا۔ اور جس طرح کسی ایسے ملک کے دستور میں جس میں جاٹوں کو زور حاصل ہو یہ بات لکھی جا سکتی ہے کہ اس ملک میں صرف ایک "دیندار جاٹ" ہی حکمران بن سکتا ہے اسی طرح اسلام کے دستور میں یہ بات لکھ دی گئی کہ یہاں ایک دیندار قریشی ہی خلیفہ بن سکتا ہے۔

یہ ہمارے بزرگوں کی طرف سے اسلام کے اس دستور اور اس نظام کی تعبیر ہو رہی ہے جس کے قیام کا مطالبہ یہ حضرات اس بیسویں صدی میں لے کر اٹھے ہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نظریے کے ساتھ ساتھ اسلامی مساوات کی تعریف و توصیف سے بھی زبانیں خشک ہوئی جا رہی ہیں۔ معلوم نہیں یہ مساوات پھر جلوہ گر کہاں ہوگی؟ غالباً مسجدوں کے اندر، لیکن امامت کا سوال تو وہاں بھی ہے۔ آخر وہاں کی امامت کسی قریشی کا اجارہ کیوں نہ ہوگی؟

اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ اگر ان بزرگوں سے پوچھا جائے کہ حضرت اس طرح حکمت عملی کی خاطر اسلام کے اصول مساوات کو توڑنے کی کوئی اور مثال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موجود ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ[1] "آپ نے اس مقصد کے لیے اصول مساوات کو بالکلیہ نہیں بلکہ اس کے صرف اس حصے کو معطل رکھا جو منصب خلافت سے متعلق تھا کیونکہ صرف اسی حد تک اس کا تعطل ناگزیر تھا۔" کوئی ان بزرگوں سے پوچھے کہ یہ راز حضورؐ نے کس پر منکشف فرمایا کہ آپ نے خلافت کے معاملہ میں مساوات کے اصول کو معطل کر دیا ہے۔ کیا حدیث کے الفاظ میں اس قسم کا کوئی اشارہ ہے یا کسی اور موقع پر آپ نے کسی کے سامنے اس حقیقت کا اظہار فرمایا۔ کیا پوری امت اسلامیہ میں کوئی شخص بھی اس بات کا گواہ ہے کہ مساوات کا اصول خلافت کے معاملہ میں حضورؐ نے معطل فرما دیا تھا۔ حضورؐ آخری نبی ہیں۔ جب حضورؐ نے خلافت کے معاملہ میں اصول مساوات

[1] کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ یہ حسین تعبیر مطلب میری ہے۔ مجھے یہ حسن بیان اور یہ اعجاز کلام کہاں نصیب

کو معطل رکھا تو آپ کے بعد اس معطل اصول کو زندہ کون کرے گا، بالخصوص جب کہ اس چودھویں صدی میں اقامت دین کے لیے اٹھنے والے بزرگ کو بھی اس کے معطل رکھنے ہی پر اصرار ہے بلکہ ان کے اقامت دین کے سارے فلسفہ کی عمارت قائم ہوتی ہی ہے اس منہدم شدہ اصول کے کھنڈروں پر۔

اللہ کے ان نیک بندوں سے کوئی پوچھے کہ یہی اس خلافت راشدہ کا تصور ہے جس کا جلوہ دنیا کو دوبارہ دکھانے کے لیے آپ حضرات اٹھے تھے اور جس کے غلغلہ سے آج ۱۶، ۱۷ سال سے لوگوں پر خواب و خور حرام ہو رہا تھا۔ اسلام کی یہی وہ جمہوریت ہے جس کے آگے آپ حضرات دنیا کی تمام جمہوریتوں کو مستحق نفرت و لعنت قرار دیتے ہیں؟ جب آپ خود مانتے ہیں کہ خلافت کے معاملہ میں اسلام کا اصول مساوات نعوذ باللہ خود حضورؐ نے معطل رکھا اور اس کے تعطل پر آج بھی آپ کو اصرار ہے تو پھر آپ کو اجتماعی و سیاسی زندگی میں مساوات کے قیام کے مطالبہ کا کیا حق ہے؟ کیا آج جن کے ہاتھوں میں سیاست کی باگ ہے، ان کے سامنے حکمت عملی کے تقاضے اور عملی سیاست کے مطالبے نہیں ہیں؟ کیا ان کے لیے آپ کے اس زریں اصول سے فائدہ اٹھانا حرام ہے؟

چوتھے اعتراض یعنی خلافت کے لیے قرشیت کی شرط پر اجماع کا جو حوالہ دیا گیا ہے تو اس کے جواب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ اس اجماع سے مراد اگر یہی اجماع ہے جو سقیفہ بنی ساعدہ میں بموجودگی تمام اکابر مہاجرین و انصار ہوا ہے، تو اس اجماع کا پتہ تمام دنیا جہان کو ہے، ہم کو نہ اس کے وقوع سے انکار ہے اور نہ اس کی صحت سے۔ لیکن اگر اس اجماع سے کوئی اور اجماع مراد ہے تو اس کا پتہ صرف امام نسفی اور شہرستانی صاحب کو ہوگا۔ ان کے سوا کسی اور کو اس اجماع کا پتہ نہیں ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجماع کے متعلق ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ اجماع اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہوا ہے بلکہ ٹھیک ٹھیک اسلام کے اصولوں کے مطابق ہوا ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف اسی اجماع کی نہیں ہے کہ یہ اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہوا ہے بلکہ اسلام کی پوری تاریخ میں ایک اجماع بھی ایسا نہیں ہے جو اسلام کے کسی اصول کو توڑ کر وجود میں آیا ہو، بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ اجماع کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ

اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہ ہو۔ اگر کوئی اجماع اسلام کے کسی اصول کے خلاف ہو تو وہ اجماع، اسلام کے شرائط اجماع کی رو سے، اجماع ہی نہیں ہے، وہ اجماع باطل ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جو اجماع ہوا ہے وہ اس بات پر نہیں ہوا ہے کہ خلافت کے معاملہ میں قریش کو ان کی قرشیت کی بنا پر ترجیح حاصل ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا یہ اجماع اس بات پر ہوا ہے کہ قریش کی دینی خدمات، ان کی سیاسی حیثیت اور ان کے اثر و اقتدار کی بنا پر ان کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہے۔ اگر قریش کو یہ چیزیں حاصل نہ ہوتیں بلکہ وہ ان اعتبارات سے دوسروں کے مقابل میں فروتر ہوتے تو یہ اجماع ہرگز ان کے حق میں نہ ہوتا حالانکہ باعتبار نسب وہ ان چیزوں کے بغیر بھی قریشی ہی رہتے، غیر قریشی نہ بن جاتے۔ اگر اس معاملہ میں قریش کی قرشیت اصل چیز ہوتی تو قریش کے لیڈروں کا سقیفہ بنی ساعدہ میں بنیادی نقطہ بحث یہ ہوتا کہ اسلام میں خلیفہ بننے کے لیے قریشی ہونا شرط ہے اور ان کی طرف سے صرف اسی ایک نقطہ کو ثابت کر دینے کے بعد ساری بحث ختم ہو جاتی لیکن آپ انصار اور مہاجرین دونوں کے لیڈروں کی تقریریں ابن قتیبہ کی الامامۃ والسیاسۃ یا تاریخ کی کسی کتاب میں پڑھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ دونوں کے سامنے وجوہ ترجیح کی فہرست میں وہی چیزیں ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر فی الواقع اسلام میں نسب اور برادری کے سوال کو یہ اہمیت ہوتی جو بتائی جا رہی ہے تو پھر خلافت کے اصل حقدار بنی ہاشم تھے اس لیے کہ نسبی شرف کے معاملہ میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا تھا لیکن اصل سوال سیاسی زور و اثر اور عوامی اعتماد کا تھا اور یہ چیز قریش کو بحیثیت مجموعی بحیثیت ایک سیاسی تنظیم کے تو حاصل تھی لیکن ان کی شاخوں میں سے کسی شاخ کو یا ان کے افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں اس درجہ حاصل نہیں تھی کہ وہ اس استحقاق میں اس وقت کے سارے حریفوں پر بازی لے جاتے۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے بھی یہ نہیں فرمایا ہے کہ امیر یا امام کا قریشی ہونا شرط ہے بلکہ یہ فرمایا کہ امراء و خلفا قریش میں سے ہوں جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضورؐ کے اس فیصلہ کی بنیاد قریش کی سیاسی حیثیت پر ہے نہ کہ ان کے نسب خاندان پر۔

اگر حضورؐ کے ارشاد کا صحابہؓ نے یہ مطلب سمجھا ہوتا کہ خلافت کے لیے قرشیت کی شرط اسلامی دستور کی ایک دفعہ ہے اور پھر اس چیز پر سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین کا اجماع ہو گیا ہوتا تو

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ جو اس اجماع کے ایک رکن رکین تھے اپنے زمانہ میں خلافت کے لیے ایسے لوگوں کے نام لینے کی جرأت کس طرح فرماتے جو قریشی نہیں تھے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آخر وقت میں جب حضرت عمرؓ سے یہ خواہش کی گئی کہ آپ اپنے بعد خلافت کے لیے کسی کو نامزد فرما دیں تو انھوں نے بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کہ کس کو نامزد کروں؟ اگر معاذ بن جبلؓ زندہ ہوتے تو ان کو نامزد کر دیتا! اگر میرا رب مجھ سے پوچھتا کہ امت محمدؐ کی زمام کس کے ہاتھ میں دے کے آئے ہو تو میں عرض کر دیتا کہ معاذ بن جبلؓ کے، اس لیے کہ میں نے تیرے رسول کو یہ فرماتے سنا تھا کہ معاذ بن جبل قیامت کے دن تمام علماء کے آگے آگے ہوں گے۔

اسی طرح انھوں نے سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ کے متعلق فرمایا کہ اگر سالمؓ زندہ ہوتے تو انتخاب خلیفہ کے لیے جو شوریٰ میں نے بنائی ہے اس کی نوبت ہی نہ آتی، میں خلافت کے لیے ان کو نامزد کر دیتا۔

غور فرمائیے کہ حضرت عمرؓ اس حسرت کے ساتھ معاذ بن جبلؓ کا نام لیتے ہیں، حالانکہ وہ قریشی نہیں تھے بلکہ انصاری تھے۔ اگر خلافت کے لیے قرشیت کی شرط پر اجماع ہو چکا تھا اور اس کی حیثیت ایک دستوری حکم کی ہوتی تو کیا حضرت عمرؓ کو اس اجماع کا اور اسلام کے اس دستوری حکم کا پتہ نہیں تھا؟ اس اجماع کی حقیقت اور اسلام کے دستور سے حضرت عمرؓ زیادہ واقف ہیں یا نسفی صاحب اور شہرستانی صاحب؟ پھر یہ بھی نگاہ میں رہے کہ حضرت عمرؓ یہ بات اس زمانہ میں فرماتے ہیں جب قریش مٹ نہیں گئے تھے بلکہ اپنی پوری قوت و شوکت کے ساتھ باقی تھے اور ان کے اندر عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ کے پایہ کے لیڈر موجود تھے۔

پھر اس سے زیادہ عجیب تر معاملہ حضرت سالمؓ کا ہے۔ یہ قریشی تو درکنار نسلاً عرب بھی نہیں تھے بلکہ باتفاق عجمی تھے اور عجمی بھی کوئی آزاد عجمی نہیں بلکہ ابوحذیفہؓ یا ان کی بیوی کے آزاد کردہ غلام۔ حضرت عمرؓ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ ہوتے تو وہ ان کو نامزد فرما دیتے۔ اب فرمائیے کہ آپ کی قرشیت والی شرط جس سے اختلاف کی جرأت آپ کے نزدیک خوارج اور معتزلہ کے سوا کسی نے نہیں کی، کہاں گئی؟ حضرت عمرؓ کے بارے میں آپ حضرات کا کیا ارشاد ہے؟ آپ آٹھ صدیوں کا جس بات پر علماء کا اجماع نقل فرما رہے ہیں اور جس پر شہرستانی صاحب اور نسفی صاحب کی گواہی ثبت ہے حضرت عمرؓ اس اجماع کو پہلی صدی کے اوائل ہی میں اپنے مذکورہ بالا ارشادات سے توڑ چکے ہیں یا نہیں؟

(باقی ص۴۹ پر)

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

حج کے بعد

ایک ماہ مکہ معظمہ میں

حج کے بعد جہازوں کی واپسی کا جو پروگرام ہمارے سفارت خانہ کی طرف سے شائع ہوا اس سے معلوم ہوا کہ ابھی پورا ایک مہینہ ہمیں مکہ معظمہ میں ٹھہرنا ہے۔ اس اطلاع سے ہمیں تو فی الجملہ خوشی ہی ہوئی۔ ہم نے خیال کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس پاک سرزمین پر پہنچا دیا ہے تو یہاں قیام کا جتنا بھی موقع ملے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم مقررہ پروگرام سے پہلے واپسی کے لیے کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن عام طور پر لوگوں کے اندر میں نے اس کے بالکل برعکس رجحان پایا۔ حج سے فارغ ہوتے ہی میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ واپسی کے لیے اس طرح بےچین ہو گئے ہیں گویا یہ سرزمین ان کو کاٹ رہی ہے۔ حجاج کے لیے عام قاعدہ یہ ہے کہ لوگ جس جہاز سے جس ترتیب کے ساتھ جاتے ہیں عموماً اسی جہاز سے اسی ترتیب کے ساتھ واپس ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ نہایت مناسب ہے، لیکن جلد باز لوگوں پر یہ شاق گذرتا ہے۔ اس قسم کے لوگ حج سے فارغ ہوتے ہی اس مقصد کے لیے تگ و دو شروع کر دیتے ہیں کہ کسی طرح یا تو ترتیب میں ان کو پہلے جگہ مل جائے یا یہ ہو کہ اگر سمندر کے جہاز سے گئے تھے تو واپسی کے لیے ہوائی جہاز میں کوئی نشست حاصل ہو جائے۔

لوگوں کے اس عام رجحان سے فائدہ اٹھا کر معلم حضرات اور غالباً سفارت خانوں سے وابستہ ملازمین بھی دلالی کا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جلد باز حاجیوں سے روپے اینٹھتے اور ان کو

ان کے حسب خواہش جگہ دلا دینے کے لیے جھوٹے سچے وعدے کرتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس معاملہ میں لوگوں کی بے صبری اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بہت سے لوگ اس کے لیے منہ مانگی رشوتیں بھی دیتے ہیں اور اپنے عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ نہایت سنگدلانہ بے وفائیاں بھی کرتے ہیں۔

اس رجحان عام نے میری جان بھی ضیق میں ڈالے رکھی۔ کچھ لوگوں کو یہ گمان ہو گیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے سفارت خانوں کے ذمہ داروں سے میرے تعلقات ہیں۔ غالباً یہ غلط فہمی لوگوں کو اس وجہ سے ہوئی کہ حج کے بعد جو سرکاری دعوتیں ہوئی ہیں ان کے دعوتی کارڈ مجھے بھی موصول ہوئے تھے۔ بس اس گمان کی بنا پر بہت سے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں سفارش کر کے ان کو پہلے جانے والے جہازوں میں کسی طرح بھجوا دوں۔ وہ مجھے متاثر کرنے کے لیے اپنے غم والم اور اپنی گھریلو پریشانیوں کی لمبی لمبی داستانیں سناتے اور مجھے ان کی داستانیں سننی پڑتیں۔ میں نے اس طرح کے لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اول تو ان سفارت خانوں کے ذمہ دار افراد سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہے اور اگر رابطہ ہوتا بھی تو یہ بات نہایت غلط ہے کہ میں ان کے ایک صحیح کام کو خراب کرنے کے لیے ان کے پاس سفارش لے کر جاؤں۔ میرا یہ عذر بالکل واضح تھا لیکن بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ میں یہ عذر محض ان کو ٹالنے کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں نے بعضوں کو یہ نصیحت بھی کی کہ خدا کے اس گھر کی زیارت کے مواقع روز روز نصیب نہیں ہوتے، اس موقع سے فائدہ اٹھائیے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے کہ جہازوں کی کمی کی وجہ سے جوار بیت اللہ میں چند دن قیام کی سعادت آپ کو مزید حاصل ہو جائے گی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ طبیعتیں ایسی اکھڑی ہوئی ہیں کہ میری کوئی نصیحت بھی ان کو جمانے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔

مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر الحمدللہ اس عام رجحان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ عورتیں اس طرح کے مواقع پر کچھ زیادہ بے صبر ثابت ہوتی ہیں، اس وجہ سے مجھے اندیشہ تھا کہ اہلیہ کو کہیں اماں کی بیماری کا خیال اور لڑکی کی یاد نہ ستانا شروع کر دے لیکن میں نے دیکھا کہ وہ بہت خوش اور مطمئن ہیں اور اس فرصت کو اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ سمجھتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے طبیعت کو بالکل یکسو کر کے اپنے ایک ماہ کے قیام کا پروگرام بنا لیا۔

میں نے اس دوران میں دو مقصد خاص طور پر پیش نظر رکھے۔

۱۔ ایک یہ کہ حجاج کا یہ ہجوم کچھ کم ہو تو ذرا اطمینان سے حرم میں بیٹھوں، بیت اللہ کا جلوہ محبوب دیکھوں، حجر اسود اور ملتزم پر پہنچنے کی کوشش کروں اور ہو سکے تو اپنے چند سجدوں کا گواہ حطیم اور مقام ابراہیم کو بھی بنانے کی سعادت حاصل کروں۔ بالخصوص خانہ کعبہ کے نظارہ سے مجھے کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی۔ اس کے دروازے کے سامنے بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر گدایانہ و ملتجیانہ وہ دعا مجھے جی بھر کر پڑھنے کی آرزو تھی جس میں "میں تیرے دروازے" پر کے دلکش الفاظ آتے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ جب یہ ہجوم عاشقاں کچھ کم ہو گا تو ہم جیسے کمزوروں اور بے ہمتوں کی بھی شاید باری آئے۔

دوسرا یہ کہ اس دوران میں حجاز اور سعودی حکومت کے حالات اور تازہ رجحانات کا کچھ جائزہ لینے کی کوشش کروں۔ اگرچہ یہ مقصد کچھ گھومے پھرے بغیر تو کما حقہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور اس کے لیے میرے حالات مساعد نہیں تھے، تاہم حج کا اجتماع عظیم مطالعہ و مشاہدہ کے لیے بہت کچھ مواد فراہم کر دیتا ہے۔

ایک تیسرا کام حج سے فارغ ہوتے ہی آپ سے آپ نکل آیا اور وہ ہے مختلف امصار و دیار کے لوگوں سے ملنا جلنا۔ یہ کام نہ میرے پیش نظر تھا اور نہ میں نے اس کے لیے اپنے آپ کو کبھی موزوں آدمی پایا۔ لیکن حج کے بعد کچھ ایسی صورتیں پیدا ہو گئیں کہ مجھے اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کچھ وقت اس کے لیے نکالنا ہی پڑا۔ اور تجربہ سے اندازہ ہوا کہ یہ چیز حج کے مقاصد کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس کے بھی کچھ فوائد ہیں بشرطیکہ آدمی اسی چیز کو مقصود و مطلوب نہ بنا لے۔

میں اب ان تینوں مذکورہ باتوں کا الگ الگ عنوانوں سے الگ الگ ذکر کروں گا اور ان میں سے آخری بات کو اس خیال سے سب سے پہلے لے رہا ہوں کہ اس سے فارغ ہو کر دوسری دو باتیں جو نسبۃً زیادہ اہمیت رکھتی ہیں کسی قدر توجہ اور تفصیل کے ساتھ لکھ سکوں۔

دعوتیں اور ملاقاتیں

اخوانی مخلصین سے ربط | سعید رمضان صاحب سے جو ملاقات منیٰ میں ہوئی اس کے بعد اخوانی مخلصین سے

رابطہ کا دروازہ کھل گیا۔ سب سے پہلے عبداللہ بن کلیب تشریف لائے۔ یہ آئے تو اپنے ساتھ ایک صاحب کا تعارفی خط بھی لائے۔ میں نے وہ خط پڑھا اور ان سے عرض کیا کہ آپ کے لیے کسی تعارفی خط کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ کی پیشانی گواہی دیتی ہے کہ آپ کا تعلق اخوان سے ہے اور اخوان سے محبت میرے نزدیک علامات ایمان میں سے ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کے خلوص نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ پھر ملاقاتوں کی تعداد جتنی ہی بڑھتی گئی میرا یہ تاثر اسی قدر بڑھتا اور مستحکم ہوتا گیا۔

یہ جدہ کی کسی کمپنی میں ملازم ہیں، وہاں سے اکثر صرف ہم سے ملنے کے لیے آتے رہتے اور جب رخصت ہوتے تو اپنے خلوص کا ایک پائدار نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ جاتے۔ یہ باتیں بہت کم کرتے ہیں، صرف کام کرتے ہیں اور دوسروں کے کام کرکے بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کا چہرہ اور انداز گفتگو تو مسکینوں کا سا ہے لیکن ان کی آنکھوں سے عزم ٹپکتا ہے۔ گفتگو کے وقت اخی کا لفظ بطور سخن تکیہ کے بار بار استعمال کرتے ہیں اور ان کی زبان سے مجھے یہ لفظ بڑا اچھا معلوم ہوتا۔ ان کے ساتھ آخر وقت تک ہمارا رابطہ قائم رہا اور اب ان سے ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن مرتے دم تک انشاء اللہ یہ رابطہ قائم رہے گا۔

ان کے دوسرے ساتھی مقبول عبدالکافی ہیں۔ شکل وشباہت میں یہ عبداللہ بن کلیب کے حقیقی بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مکہ معظمہ میں جرول کی مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں اور غالباً کچھ تعلیم کا شغل بھی رکھتے ہیں۔ ان کا قیام چونکہ مکہ معظمہ ہی میں تھا اس وجہ سے ان سے اکثر ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات بھی۔

ان کے علاوہ اخوان سے تعلق رکھنے والے عرب کے مختلف حصوں کے چند اور مخلصین بھی اکثر ملتے رہے۔ افسوس ہے کہ ان کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔ ان میں سے ایک نوجوان مجھ سے اکثر بحثیں بھی کیا کرتے تھے۔ یہ تعلیم یافتہ تو کچھ زیادہ نہیں تھے لیکن ذہن ایک صحافی کا رکھتے تھے اس وجہ سے حالات سے بہت باخبر تھے۔ ان کو جماعت اسلامی سے میری علیحدگی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے بڑا اصرار تھا۔ میں نے بہتیرا ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طرح اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ ان کو یہ گمان تھا کہ میں صرف انتخابات کے مسئلہ کی وجہ سے جماعت سے

علیحدہ ہوگیا ہوں۔ بالآخر مجھے مختصر طور پر کچھ وجوہ بتانے پڑے۔ جب انھیں میرے موقف کے بارے میں اطمینان ہوگیا تو انھوں نے خود ہی مجھے اخوان کی تمام پچھلی تاریخ سنائی جس سے میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔

اس دوران میں مجھے برابر سعید رمضان صاحب کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار رہا۔ میں اوپر ذکر کرچکا ہوں کہ انھوں نے منیٰ میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ مکہ معظمہ کے فلاں ہوٹل میں ٹھہریں گے اور وہاں ہم سے تفصیلی گفتگو کریں گے۔ میں نے ہوٹل والوں سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ وہ منیٰ سے واپس آتے ہی مدینہ منورہ چلے گئے۔ بالآخر چند دنوں کے بعد عبداللہ بن کلیب کے واسطہ سے مدینہ منورہ سے مجھے ان کا تار موصول ہوا کہ میں ان سے ملاقات کے لیے کوئی تردد نہ کروں، وہ خود ملاقات کی کوئی شکل مکہ معظمہ یا جدہ میں نکالیں گے۔ میں اس تار کے بعد مطمئن ہوگیا۔

ایک جمعہ کو نماز سے فارغ ہوکر میں مکان پر واپس آیا اور دسترخوان بچھاکر کھانا شروع کرنا چاہتا ہی تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ حکیم صاحب نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ سعید رمضان صاحب اور ان کے ساتھ ان کے سکریٹری ہیں۔ ہم نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی اس عزت افزائی سے بہت خوش ہوئے۔ وہ ہماری چھوٹی سی کوٹھری کے اندر ہمارے سامانوں سے ٹیک لگاکر بے تکلف بیٹھ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آج ہم ایک ساتھ کھانا کھائیں گے لیکن انھوں نے شکریہ کے ساتھ طبیعت کی کچھ گرانی کی شکایت کی اور محض ہماری خاطر سے دو تین دانے انجیروں کے منہ میں ڈالے۔

اسی روز حرم سے نکلتے ہوئے کسی شخص نے ایک پمفلٹ مجھے پکڑایا تھا۔ یہ جمال عبدالناصر صاحب کے خلاف تھا اور اس میں ظاہر غالباً یہ کیا گیا تھا کہ یہ مصری حجاج کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ میں نے اس کو پڑھ کر کمرے میں ڈال دیا تھا۔ سعید رمضان صاحب کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس کو پڑھنے لگ گئے۔ جب وہ اس کو پڑھ چکے تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ پمفلٹ آپ لوگوں کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا، یہ منسوب تو ہماری ہی طرف کیا جائے گا لیکن ہم اس سے بالکل بری ہیں۔

میں نے اس ملاقات میں خاص بات یہ محسوس کی کہ سعید رمضان صاحب نہایت متردد اور پریشان ہیں۔ منیٰ کی ملاقات میں میں نے ان کو ہشاش بشاش پایا تھا۔ اس دوران کا سب سے

زیادہ اہم واقعہ عراق کا انقلاب تھا اس وجہ سے میں نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو ان کی یہ پریشانی عراق کے حوادث ہی کا نتیجہ ہے۔ مجھے منیٰ میں سعید رمضان صاحب ہی سے معلوم ہوا تھا کہ عراق کے اسلامی رہنما محمود صواف صاحب بھی حج کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان سے پہلے سے شرفِ ملاقات حاصل تھا۔ اس وجہ سے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس موقع پر تجدید ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن جب میں نے ان کی بابت سوال کیا تو سعید رمضان صاحب نے ایک تشویش انگیز انداز میں فرمایا کہ وہ عراق کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر فوراً واپس چلے گئے ہیں۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔

سعید رمضان صاحب عالم اسلامی کے حالات کے بارے میں اس وقت ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے میرا ارادہ تھا کہ جب ان سے ملاقات ہوگی تو میں ان سے عراق کے انقلاب کی صحیح نوعیت سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس ملاقات میں ان کو میں نے اتنا افسردہ پایا کہ کسی موضوع پر بھی کوئی گفتگو چھیڑنا میں نے مناسب نہیں خیال کیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس وقت اس غریب الدیار کا اس دنیا میں وہی حال ہے جس کی تعبیر سیدنا مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ سے فرمائی ہے کہ "سانپوں کے لیے بل ہیں اور پرندوں کے لیے بھٹ لیکن ابن آدم کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

وہ تھوڑی دیر کے بعد ہم سے رخصت ہوئے اور کہا کہ اب تم ملاقات کی فکر نہ کرنا۔ میں خود اس کی فکر کروں گا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ان کے تشویش زدہ چہرے نے مجھے کئی دن تک پریشان رکھا اور میں ان کے لیے نمازوں کے اوقات میں برابر دعائیں کرتا رہا۔

ہمارے ان اخوانی احباب نے اپنے اپنے گھروں پر ہمیں کھانے پر بھی بلایا اور ہم نے ان کی دعوتیں بلا کسی عذر کے قبول کیں۔ ان لوگوں کے اخلاص نے ہمیں اس طرح مسخر کر لیا تھا کہ ہمارے لیے ان کی کسی بات کا انکار ممکن ہی نہیں رہ گیا تھا۔

سیٹھ احمد صاحب کی دعوت مکہ معظمہ میں ایک دیندار اور مخیر تاجر سیٹھ احمد صاحب[1] ہیں۔ انھوں نے پاکستان اور ہندوستان کے ان علماء کو جو حج کے لیے آئے تھے کھانے پر بلایا۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ ان لوگوں کے لیے مل بیٹھنے اور تبادلۂ خیالات کا ایک موقع فراہم کریں۔ میں تو غالباً اپنی عام عادت کے مطابق معذرت ہی کر دیتا لیکن عین وقت پر مدرسہ کے ایک عالم دین۔ نام غالباً

[1] یہ سارا سفرنامہ میں محض حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ میں نے اس کے لیے کوئی نوٹ نہیں رکھا۔ اسی وجہ سے اگر واقعات کی ترتیب یا ناموں کے بارے میں ناظرین کوئی غلطی محسوس کریں تو از راہِ کرم اس کو سہو پر محمول فرمائیں۔ بالخصوص ناموں کے یاد رکھنے

مولانا عبدالباری — میرے مکان پر تشریف لائے اور نیچے سے یہ پیغام بھجوایا کہ میں قلب کا مریض ہوں، مجھے ڈاکٹر نے زینہ پر چڑھنے سے روکا ہے، اس وجہ سے نیچے آ کر میری بات سن جاؤ۔ میں نیچے اترا تو انھوں نے فرمایا کہ اس دعوت میں شرکت کے لیے میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ میرے ساتھ تمھیں چلنا ہوگا۔ اس بیماری کی حالت میں ان کی اس تکلیف فرمائی اور ان کے اس خلوص سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ کسی معذرت کا یارا باقی نہیں رہا۔ میں اور حکیم صاحب دونوں چپ چاپ ان کے ساتھ ہو لیے۔

یہ دعوت نہایت پر تکلف تھی۔ سیٹھ صاحب نے نہایت عمدہ عمدہ عربی اور عجمی کھانے کھلائے۔ اس دعوت کی چند ملاقاتیں قابل ذکر ہیں۔

ایک عرب عالم جو حرم میں درس دیتے ہیں میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ان کا ادبی ذوق نہایت شستہ اور پاکیزہ ہے۔ ان کا نام تو مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا لیکن ان کا ایک لطیفہ مجھے نہیں بھولتا۔ میرے پاس حجاز کے اخباروں میں سے کوئی اخبار پڑا ہوا تھا۔ میری نظر جدہ ریڈیو کی نشریات کے پروگرام پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اس میں تلاوت قرآن کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی ذکر ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت یہ آپ کے ریڈیو سے کون سی موسیقی نشر ہوتی ہے؟ انھوں نے جواب میں یہ چبھتا ہوا فقرہ فرمایا کہ "جلالۃ الملک کی حمد و نعت" اور کون سی موسیقی!

اس دعوت میں مجھے پہلی بار مولانا قاری محمد طیب صاحب سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے اکابر دیوبند میں سے زیادہ ملنے جلنے کے مواقع صرف حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتے رہے ہیں۔ بعض امور میں ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے کے باوجود مجھے ہمیشہ ان سے عقیدت و محبت رہی اور ان کی شفقتوں کی وجہ سے ان کے سامنے میں کسی قدر بے تکلف بھی تھا۔ دوسرے اکابر سے چونکہ مجھے زیادہ ملنے جلنے کے مواقع نہیں ملے اس وجہ سے ان سے طبیعت میں ایک قسم کا حجاب رہا۔ یہی معاملہ کچھ مولانا قاری محمد طیب صاحب کے ساتھ بھی تھا۔ مولانا کے علم و فضل کا قائل تو میں ان کے مقالات و خطابات سے تھا، ان کے تقویٰ و دینداری اور ان کے حسن بیان کی تعریفیں دوسروں سے سنی تھیں۔ ان کی سادگی، بے تکلفی اور ان کے حسن اخلاق کا اندازہ اس ملاقات سے ہوا۔ اس ملاقات میں مولانا کا حسن اخلاق ہمارے لیے کچھ ایسا جرأت آموز ہوا کہ حکیم صاحب نے ایک روز ان کو اپنے ہاں چائے

جینے کی بھی زحمت دی۔ مولانا نے اپنے صاحبزادے کی علالت اور دوسری مصروفیتوں کے باوجود یہ دعوت قبول فرمائی جس کے لیے ہم ان کے نہایت ممنون ہوئے۔

اسی دعوت میں پہلی بار تبلیغی جماعت کے ان علماء اور کارکنوں سے ملاقات ہوئی جو عرب میں تبلیغ دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کے لیڈر مولانا سعید صاحب ہیں۔ انھوں نے اس مجلس میں نہایت مناسب موقع سے اپنے کام کے تعارف کی ایک راہ نکال لی اور بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے ان کاموں کی روداد سنائی جو نجد و حجاز کے تبلیغی دوروں میں ان کی جماعت انجام دیتی ہے۔ مجھے اس روداد سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لوگ حجاز و نجد کے دور افتادہ قبائل تک بھی اپنی دعوت لے کر پہنچ چکے ہیں۔ اس مقصد کے عشق میں انھوں نے پہاڑوں اور صحراؤں کے خطرناک اور پر مشقت راستے بھی طے کیے ہیں اور بسا اوقات مختلف قسم کی آزمائشوں میں بھی مبتلا ہوئے ہیں۔ میرے لیے ان کی روداد کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ خاص طور پر وہ تھا جس کا تعلق اہل بدو کی معاشرت، ان کی روایات، ان کے موجودہ دینی رجحانات اور اس دعوت کے ساتھ ان کی دلچسپی کی نوعیت سے تھا۔ مجھے اہل بدو کی زندگی اور ان کی معاشرت سے ابتدا سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ جاہلی شعراء میں سے ان شاعروں کے کلام کا میں بڑا دلدادہ رہا ہوں، جنھوں نے اپنے کلام میں بدویانہ زندگی کی مصوری کی ہے۔ جب یہ مجلس برخاست ہوئی تو میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اگر ان لوگوں کی معلومات اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی اور موقع ملے تو یہ بہت اچھا ہو۔

نجد و حجاز کے قبائل میں جو کام یہ لوگ کر رہے ہیں اس کی افادیت کا صحیح اندازہ تو میرے لیے مشکل تھا لیکن یہ کام جس عزم و ہمت، جس ایثار وقت و مال اور جس جوش و خلوص کے ساتھ یہ لوگ کر رہے ہیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ ہر سال حج کے لیے جانے والوں میں سے یہ لوگ بہت سے نوجوانوں کو اپنے تبلیغی دوروں میں رفاقت کے لیے آمادہ کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر جو مشنری اسپرٹ میں نے محسوس کی بڑی قابل قدر ہے۔ مولانا سعید صاحب نے بار بار یہ خواہش کی کہ میں قریب جوار کی بعض بستیوں اور قصبات میں ان کے ساتھ چلنے کے لیے وقت نکالوں۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے حالات اس کے لیے سازگار نہ تھے۔ بس ایک روز اس درس میں شریک ہوا جو حرم میں ان کے زیر اہتمام

ہوتا تھا۔

اس دوران میں حرم اور حجاج کے حالات کا جو مطالعہ میں نے کیا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ حجاج کی خدمت اور تربیت کے بہت سے کام ایسے کیے جا سکتے ہیں جو نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اگر کوئی جماعت ان کاموں کے لیے اٹھے تو سعودی حکومت اس کا خیر مقدم کرے گی۔ میں نے سوچا کہ اگر تبلیغی جماعت زمانہ حج میں یہ خدمات اپنے ذمہ لے لے تو یہ اس کے مشن کے نقطۂ نظر سے مناسب بھی ہیں اور مفید بھی۔ میں نے بالاجمال اپنے اس خیال کا مولانا سعید صاحب سے ذکر کیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ باتیں تفصیل کے ساتھ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی سے کرنے کی ہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب

ایک کرم فرما ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کا ذکر بھی مجھے کرنا ہے۔ یہ غالباً وہاں کے رہنے والے ہیں اور ایک مدت سے مکہ معظمہ کے الاسعاف الخیری کے اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔ حاکم صاحب نے کئی مرتبہ ان کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ وہ اس عاجز سے شوق ملاقات رکھتے ہیں لیکن بیمار ہیں اس وجہ سے وہ یہاں نہیں آ سکتے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ایک دن ان کے ہاں چائے بھی پیوں اور اپنی بعض موجودہ تکالیف کے بارے میں ان کا طبی مشورہ بھی حاصل کروں۔ یہ دوسری چیز میرے لیے بڑی ترغیب کا پہلو رکھتی تھی۔ انفلوئنزا کے حملے کے بعد سے میری کھانسی کا سلسلہ ٹوٹا نہیں تھا اور اس سے مجھے خاصی تکلیف تھی۔ میں ایک دن وقت نکال کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت اور بڑے اخلاص سے ملے۔ نہایت اہتمام سے چائے پلائی۔ پھر تفصیل کے ساتھ میرا طبی معائنہ کیا اور نسخہ لکھا۔ الحمد للہ ان کے نسخہ سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔

اس دعوت میں تبلیغی جماعت کے بعض ارکان سے بھی ملاقات ہوئی اور قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ یہ حج کے ساتھ ساتھ رد قادیانیت کا مشن بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ آدمی کو کسی چیز کی دھن ہو تو ایسی ہو۔

میری خواہش کے خلاف جماعت اسلامی سے میری علیحدگی کے وجوہ سے متعلق بھی بعض لوگوں نے سوالات کیے۔ میں نے کہا کہ میں اسلام کی سرپرستی کا نظریہ نہیں رکھتا بلکہ اسلام کی خدمت کا نظریہ رکھتا ہوں اور اسلام کی خدمت کے بنیادی اصول میرے نزدیک یہ ہیں۔ میں نے خدمت اسلام کے یہ اصول اجمال کے ساتھ بیان کر دیے۔

ملک عبدالحق صاحب ملک عبدالحق صاحب کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ انھوں نے متعدد بار ہمیں کھانے اور ناشتے پر بلایا۔ ان کے ہاں تبلیغی جماعت کے علماء اور کارکنوں سے پھر ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے قبایل میں ان کے تبلیغی دوروں کی وہ دلچسپ اور موثر داستان مکمل کرائی جو سیٹھ احمد صاحب کی دعوت میں ناتمام رہ گئی تھی۔ ملک عبدالحق صاحب نے اس سفر میں شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ نہایت مخلصانہ اور برادرانہ سلوک کیا۔

ڈاکٹر احمد علی صاحب ڈاکٹر صاحب کے الطاف سے یوں تو ہم اس دوران میں برابر متمتع ہوتے رہے تھے لیکن ضابطہ کی دعوت ان کے ہاں ابھی باقی تھی اور یہ ہماری مصروفیتوں کے سبب سے ٹلتی جا رہی تھی۔ اب مزید ٹالنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی اس وجہ سے انھوں نے ایک دن مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں خاص پنجاب کے لوگوں کے ذوق کے نہایت لذیذ کھانے کھلائے۔

اس دعوت میں مولانا اسمٰعیل صاحب غزنوی سے ملاقات ہوئی، اور یہ موصوف سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس دعوت میں ڈاکٹر صاحب کے ایک عرب دوست بھی تھے۔ انھوں نے اپنے کسی چھوٹے بچہ کو تعلیم و تربیت کے لیے مصر بھیج رکھا تھا۔ انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ اس کا ایک فقرہ سنایا جس کے سنانے سے ان کا مقصود یہ تھا کہ بچہ اب اہل مصر کے مخصوص محاورات بولنے لگا ہے۔ اس سے مجھے اس علمی رعب اور اثر کا اندازہ ہوا جو مصر کا اہل حجاز پر اس وقت قائم ہو چکا ہے۔

ان عرب صاحب کا ایک اور لطیفہ بھی مجھے نہیں بھولتا۔ عرب کے خوشحال لوگوں کے گھروں میں تمدنی سامانوں کی کثرت کا کچھ ذکر چلا تو انھوں نے یہ مزیدار فقرہ کہا کہ ہمارے گھروں میں تو امریکہ کی بنی ہوئی وہ چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جو اہل امریکہ کے گھروں میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت پسند آیا۔ میرے نزدیک یہ صحیح مبالغہ کی ایک بلیغ ترین مثال ہے۔

ذکریا صابر سلمہ ایک روز میں عشا کی نماز پڑھ کر اٹھا تو جاوی وضع و قطع کے ایک نوجوان مجھ سے لپٹ گئے۔ جب میں کچھ حیران سا ہوا تو وہ بولے کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں، آپ تو میرے باپ اور میرے بزرگ ہیں۔ میں سماٹرا کا رہنے والا ذکریا صابر ہوں اور مدرسۃ الاصلاح (اعظم گڈھ) میں دو سال آپ کی تربیت میں رہ چکا ہوں۔ میں نے جب انھیں پہچانا تو جوشِ محبت سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ

فی الواقع مدرسۃ الاصلاح میں میری نگرانی میں رہ چکے تھے اور ان کی نیکی و سعادت مندی کا میں بڑا قدردان تھا۔ پھر یہ اپنے وطن واپس چلے گئے تھے اور وہاں اپنی صلاحیت کے مطابق دین کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کی بعض چیزیں اپنی ملکی زبان میں منتقل کیں۔ جاپان کے حملہ کے زمانہ میں یہ مختلف مصایب میں مبتلا ہوئے۔ اس ابتلا سے چھوٹے تو ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں خدا کے فضل سے اب اچھا مکان رکھتے ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ خوش ہیں۔ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو باصرار کھانے پر بلایا۔ جب میں دسترخوان پر بیٹھا تو انھوں نے بتایا کہ بعض چیزیں میری پسند کی انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے تیار کی ہیں۔ میرے دل میں ان کے اس خلوص کی بڑی قدر ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ کھانے پینے کی چیزوں کے معاملہ میں خود تو میں بالکل بے حس اور بے ذوق واقع ہوا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے احباب دیے ہیں جو اتنی طویل جدائی کے بعد بھی میرے ذوق کا خیال رکھتے ہیں اور اس کے لیے اہتمام کرتے ہیں۔

ان عزیز سے جب سے ملاقات ہوئی یہ ہمارے لیے دودھ کی بوتلیں بھیجنے لگے۔ یہ دودھ بکریوں کا ہوتا تھا لیکن نہایت اچھا ہوتا تھا۔ میں یہاں کی بکریوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ آگے پیچھے چار سوکھی سوکھی لکڑیاں گاڑ کر ان پر ایک کھال سوکھنے کے لیے ڈال دی گئی ہے لیکن انہی سوکھی بکریوں کے نیچے قدرت نے دودھ کی بوتلیں لٹکا رکھی ہیں۔

شیخ ہیئۃ امر بالمعروف اس دوران میں حجاج اور حرم سے متعلق جو چیزیں میں نے محتاج اصلاح محسوس کیں حکیم صاحب کا اصرار تھا کہ ان کو حکومت کے ذمہ داروں کے علم میں لانا ضروری ہے۔ میرے لیے یہ کام نہایت مشکل تھا لیکن یہ ایک اسلامی فرض تھا اس وجہ سے مجھے حکیم صاحب کی بات ماننی پڑی اور میں ایک روز سعودی عرب کے شعبہ امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے صدر سے ان کے دفتر میں ملا۔ شیخ اپنے روایتی اخلاق کے ساتھ ملے۔ گفتگو کا موقع دیا لیکن اس وقت ان کے دفتر میں دوسرے ضرورت مند بھی موجود تھے۔ میں ان کے سامنے ان اصلاحی مسایل کا چھیڑنا مناسب نہیں خیال کرتا تھا اس وجہ سے میں نے یہ کہہ کے اجازت چاہی کہ میں ان شاء اللہ پھر کسی مناسب موقع سے حاضر ہوں گا۔ شیخ نے جب یہ محسوس کیا کہ میں علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے کہلایا کہ اگر دوسروں کی موجودگی گفتگو سے مانع ہے تو ان لوگوں کو ہٹایا بھی جا سکتا ہے لیکن میں نے یہی پسند کیا کہ کسی وقت شیخ سے ان کے مکان پر

ملاقات کی جائے۔ چنانچہ شیخ نے فرمایا کہ میں جدہ جا رہا ہوں، وہاں سے فلاں روز واپس ہوں گا، اس کے بعد ہم ان کے مکان پر ان سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہم شیخ کے مکان پر تو حاضر ہونے کا موقع نہ نکال سکے لیکن ایک روز ان کے نائب صاحب نے از راہ نوازش ہمیں ناشتہ کی دعوت دی اور اس طرح ہمیں ساری باتیں تفصیل کے ساتھ شیخ تک پہنچانے کے لیے ایک قابل اعتماد واسطہ مل گیا۔ ہم نے وہ باتیں ان سے عرض کر دیں جو اس دوران میں ہم نے محتاج اصلاح محسوس کی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم نے شعبہ امر بالمعروف کے سامنے بعض مفید تجویزیں بھی پیش کیں جن کو اگر شعبہ عملی جامہ پہنا سکے تو ہمارے خیال میں بہت مفید ہو سکتی ہیں۔ ان باتوں کا ذکر مناسب موقع سے آگے آئے گا۔

متفرق ملاقاتیں | ان کے علاوہ دو تین مخلصین نے اپنے اپنے گھروں پر چائے پر بلایا لیکن مجھے ان کے نام یاد نہیں رہے۔

مدرسہ شرعیہ ریاض کے چند فارغین برابر ملتے رہے۔ ان میں سے دو مخلصین کا تعلق تو ملیبار کے علاقہ سے تھا اور ایک ہمارے پاکستان ہی کے رہنے والے ہیں۔ ان کا اسم گرامی مولانا محمد شریف ہے۔ ان نوجوانوں کے اخلاص اور ان کے علم و فضل کے سبب سے ان سے ایک خاص قسم کا قلبی ربط قائم ہو گیا۔

بعض پاکستانی نوجوان جو مصر یا دمشق میں زیر تعلیم ہیں وہ بھی وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔

سیلون کی جماعت اسلامی کے امیر اپنے بعض رفقا کے ساتھ حج کے لیے آئے تھے ان لوگوں کو جب میرا پتہ چلا تو برابر میری قیام گاہ پر بھی اور حرم میں بھی یہ لوگ برابر مجھ سے نہایت محبت سے ملتے رہے۔ میں مغرب اور عشا کی نمازوں کے درمیان عموماً باب بنی شیبہ کے پاس والے کنکریوں کے پلاٹ میں یا مقام ابراہیم کے پاس بیٹھتا۔ یہ مخلصین بھی وہیں جمع ہو جاتے اور مختلف علمی و مذہبی مسائل سے متعلق سوالات کرتے۔

بمبئی اور سورت کے علاقوں کے کچھ مخلصین بھی بڑی محبت سے ملتے رہے۔

مختلف اسلامی تحریکات سے یہ وابستہ حضرات جب جمع ہو جاتے تو عجیب لطف آتا۔ کچھ لوگ عربی میں اپنے سوالات پیش کرتے، کچھ انگریزی میں اور کچھ اردو میں۔ زبانیں مختلف ہوتیں لیکن مسائل کم و بیش ایک ہی طرح کے۔ یہ صحبتیں چند ہی روز رہیں لیکن ان تمام ملنے والوں سے کچھ ایسا ربط قلبی سا ہو گیا تھا کہ جب یہ لوگ اپنے اپنے وطنوں کو رخصت ہونے لگے تو ان میں سے ہر ایک کی جدائی میرے دل پر شاق گذری۔ میری دلی دعا ہے کہ اسلامی ہم

رشتہ کے یہ عزیز جہاں بھی ہوں خوش اور مطمئن رہیں اور ان کی قوتیں اور تمام صلاحیتیں اللہ کے دین کی خدمت میں صرف ہوں۔

بقیہ تذکرہ و تبصرہ

جو ادارے مسلمان ملکوں میں قائم ہوں ان کے سامنے مندرجہ ذیل کام فی الحال ہونے چاہئیں۔

(۱) ایسے اشخاص کی تیاری جو بیک وقت مذہب اور جدید فکر و فلسفہ دونوں میں رسوخ رکھتے ہوں اور جو اس بات کا عہد کریں کہ وہ اپنی زندگیاں اسلام کے لیے وقف کریں گے۔

(۲) علمی و فکری تربیت کے ساتھ ساتھ ان اشخاص کی ایسی عملی تربیت کہ یہ جس میدان میں بھی کام کریں اسلامی اخلاق و سیرت کا نمونہ بن کر کام کریں۔

(۳) ان تمام مسائل و عنوانات پر بلند پایہ اور ٹھوس کتابیں تیار کرانا جو اس وقت مغربی فکر و فلسفہ اور اسلام کے تصادم سے سامنے آ رہے ہیں اور جن کے سبب سے لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شبہات و شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔

(۴) بلند پایہ رسائل، موثر اور مفید کتابچوں، دار المطالعوں، علمی لکچروں اور قرآن و حدیث کے حلقہائے درس کے ذریعے سے عوام کے ذہنوں کی اصلاح و تربیت۔

یورپ میں جو مرکز قائم ہو وہ ان مقاصد کے ساتھ ساتھ جن کا ذکر ڈاکٹر سعید رمضان صاحب نے کیا ہے مندرجہ ذیل مقاصد بھی اپنے پیش نظر رکھے۔

(۱) ان مسلمان طلبہ کی مذہبی و فکری رہنمائی جو مختلف ممالک سے تحصیل علم کے لیے یورپ جاتے ہیں۔

(۲) اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر بلند پایہ کتابوں کی مغربی زبانوں میں نشر و اشاعت اور لکچروں کا اہتمام۔

(۳) ایک بلند پایہ علمی و تحقیقی رسالہ کا اجرا جو اسلام سے متعلق ان شبہات و شکوک کو دور کر سکے جو اس دور کے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔

(۴) اگر وسائل فراہم ہو سکیں تو کسی موزوں مقام پر مسلمانوں کی ایک اسلامی نو آبادی اور ایک معیاری دار العلوم کا قیام

یہ ایک خالص مذہبی، علمی اور تربیتی کام ہے جس میں ہر دینی احساس رکھنے والا مسلمان حصہ لے سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم پاکستان کے مسلمان اس وقت جو کچھ کر سکتے ہیں اور جو کچھ ہمیں کرنا چاہیے اس پر ہم انشاء اللہ آئندہ شمارے میں روشنی ڈالیں گے۔

(۲)

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ (بھارت) سے یہ غم انگیز اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مدرسہ کے ناظم جناب حاجی رشید الدین صاحب انصاری ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۹ء کی صبح کو رحلت فرما گئے۔ حاجی صاحب مرحوم، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے حقیقی بھائی تھے۔ مولانا کے انتقال کے بعد انہی نے مدرسہ کی نظامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور پھر مدرسہ کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اب اگرچہ کچھ سالوں سے ضعف و پیری کے سبب سے معذور و مجبور ہو گئے تھے، کسی عملی خدمت میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن مدرسہ کے ساتھ ان کا قلبی و روحانی تعلق قائم تھا اور یہ تعلق بہت سی برکتوں کا باعث تھا۔

مجھے حاجی صاحب مرحوم کے ساتھ ۱۳-۱۴ سال مدرسہ کی خدمت کا موقع ملا ہے۔ اس پوری مدت کے ذاتی تجربات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کو نہایت شریف، نہایت کریم النفس، نہایت رقیق القلب، نہایت خدا ترس، اور نہایت محبت کرنے والا اور لوگوں کے کام آنے والا انسان پایا۔ وہ کسی کو ضرر پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی کی تکلیف اور پریشانی کا حال سنتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی کام میں مدد کا طالب ہوتا تو خواہ وہ کوئی چھوٹا آدمی ہو یا بڑا، فوراً اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے اور اس کا کام کر کے بہت خوش ہوتے۔

اپنے بڑے بھائی یعنی مولانا مرحوم سے ان کو محبت عشق کے درجہ تک تھی۔ مولانا مرحوم کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ ان دونوں بھائیوں کی محبت جاننے والوں کے حلقہ میں ضرب المثل رہی ہے۔ مولانا کی زندگی میں یہ اپنی وسیع زمینداری کا انتظام دیکھتے اور مولانا مرحوم اپنے علمی و مذہبی کاموں میں مشغول رہتے۔ مولانا کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ میرے اور رشید کے حال پر سعدی کی وہ حکایت صادق آتی ہے، جس میں انھوں نے دو بھائیوں کا حال لکھا ہے کہ "دو برادر بودند، یکے علم آموخت دیگرے مال اندوخت"۔ مولانا مرحوم کے فیض صحبت سے قرآن مجید کی تلاوت سے بڑی گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ روزانہ صبح کو تلاوت بڑے اہتمام سے کرتے اور چونکہ عربی نہیں جانتے تھے اس وجہ سے بہت سے اردو انگریزی ترجمے سامنے رکھ کر قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے۔ غالباً ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں مجھ سے آخری ملاقات ہوئی تو چپکے سے میرے کان میں فرمایا کہ "امین، چند رکعتیں تہجد کی بھی پڑھنے کی توفیق مل جاتی ہے۔" یہ سب مولانا

مرحوم سے دلی محبت کا فیضان تھا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر دلی ہمدردی کا مستحق ہے کہ ادھر یکے بعد دیگرے اس کے دو ستون گر گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مولانا کے عزیز ترین اور قابل ترین شاگرد اور مدرسہ کے صدر مدرس مولانا اختر احسن صاحب مرحوم نے انتقال فرمایا۔ اور اب اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مولانا کے عزیز ترین بھائی اور مدرسہ کے ناظم جناب حاجی صاحب مرحوم نے رحلت فرمائی۔ یہ دونوں حادثے مدرسہ کے لیے بڑے ہی سخت ہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مرحومین کو جنت نصیب کرے اور مدرسہ کو ان کے نعم البدل عطا فرمائے۔

میں اب کن لفظوں میں بتاؤں کہ ان دونوں ہی ہستیوں سے میرے ذاتی تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ دل کی بہت سی باتیں الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتیں اور جو باتیں ادا نہ ہو سکے اس کا راز نہفتہ ہی رہنا بہتر ہے۔ بس ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں اور اپنے لیے اس بات کی کہ جو فرصت حیات میسر ہے وہ رب کی رضا کے کاموں میں بسر کرنے کی توفیق حاصل ہو۔

(۳)

چند ضروری باتیں میثاق سے متعلق بھی نوٹ فرما لیجیے:

۱۔ یہ پرچہ پہلی جلد کا آخری پرچہ ہے۔ جنوری ۱۹۶۰ء سے رسالہ کی دوسری جلد انشاء اللہ شروع ہو گی۔ یہ پہلی جلد ۶ پرچوں پر مشتمل ہے۔ آئندہ زندگی ہے تو ہر ششماہی پر ایک جلد تمام ہو جایا کرے گی۔

۲۔ بہت سے لوگ میثاق کے پہلے نمبر کے لیے دفتر کو فرمائش بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لیے گذارش ہے کہ میثاق کا پہلا شمارہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اس کے لیے کوئی صاحب فرمائش نہ بھیجیں۔ البتہ پہلے شمارے میں ہماری تفسیر — تدبر قرآن — کا جتنا حصہ چھپا تھا اس کو دوبارہ چھپوایا جا رہا ہے تاکہ جو لوگ ابتدا سے پرچہ خریدنا چاہیں ان کی فائل کم از کم پہلے شمارے کے تفسیر کے حصہ سے محروم نہ رہے۔

۳۔ "تدبر قرآن" کے بعض قدر دانوں کا بڑی شدت کے ساتھ اصرار ہے کہ رسالہ میں اس کے صفحات اس طرح لگائے جائیں کہ آسانی سے الگ کر کے فائل میں جمع کیے جا سکیں۔ اس کے حق میں جو دلیلیں انھوں نے دی ہیں ان میں سے بعض بلاشبہ وزنی اور قابل لحاظ ہیں۔ لیکن ابھی ہمارا دل اس تجویز پر مطمئن نہیں ہوا ہے۔ اس صورت میں لازماً مضمون کے بجائے صفحات کی پیروی کرنی پڑے گی۔ اکثر ایسا ہو گا کہ بغیر کسی سلسلہ کلام کے مضمون شروع ہو گا اور اسی طرح کسی خاص حد پر پہنچائے بغیر بیچ سے اس کو کاٹ دینا پڑے گا۔ مضمون کا

اس طرح بے ربط طریقہ پر قارئین کے سامنے آئے پڑھنے والوں کو شاق گذرے یا نہ گذرے لیکن مضمون کے مصنف پر تو بڑا ہی شاق گذرے گا اس وجہ سے یہ تجویز میرے ذوق کے تو بالکل خلاف ہے لیکن ایک دوست نے نہایت سچی بات لکھی ہے کہ " اس مسئلہ کا تعلق تو رسالہ کے خریداروں سے ہے، اگر وہ اس کے خواہش مند ہیں تو مجھیں اس میں کیوں عذر ہے"۔ اس وجہ سے میں اس مسئلہ کو رسالہ کے خریداروں کے سامنے رکھتا ہوں۔ اگر ان کی اکثریت نے یہی رائے دی کہ مذکورہ تجویز پر عمل کیا جائے تو جنوری ۱۹۶۰ء کے شمارے سے اس تجویز پر عمل کیا جائے گا۔

۴۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ بعض اہل قلم اس غلط فہمی میں ہیں کہ میں میثاق کے صفحات کو صرف اپنے ہی مضامین کے لیے خاص رکھنا چاہتا ہوں، اس میں دوسروں کے مضامین کی اشاعت اس کی پالیسی کے خلاف ہے۔ یہ غلط فہمی غالباً اس وجہ سے ہوئی ہے کہ اب تک عملاً یہی صورت رہی ہے کہ اس میں صرف میرے ہی قلم سے نکلی ہوئی چیزیں چھپی ہیں کسی اور صاحب قلم کی کوئی چیز اس میں نہیں نکلی۔ لیکن ایسا ہوا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ دوسروں کے مضامین کی اشاعت رسالہ کے مقصد کے خلاف ہے بلکہ اس کی وجہ صرف مجبوری تھی۔ دوسرے اہل قلم جن سے تعاون کی امیدیں تھیں وہ وقت نہ نکال سکے اس وجہ سے سارا رسالہ ہر ماہ تنہا مجھ ہی کو بھرنا پڑا۔ دوسرے اہل قلم کے مضامین کا میثاق بڑی خوشی سے خیر مقدم کرے گا۔ بس شرط یہ ہے کہ مضامین رسالہ کے معیار اور مقصد سے الگ نہ ہوں۔

۵۔ جن حضرات نے استفسارات بھیجے ہیں، ان کے جوابات ایک مناسب ترتیب کے ساتھ خدا نے چاہا تو اگلے شمارے سے شائع ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اب تک جو تاخیر ہوئی ہے وہ مجبورانہ تھی امید ہے کہ مستفسرین معاف فرمائیں گے۔

۶۔ اسلامی قانون کا سلسلہ جگہ کی کمی کے سبب سے اس شمارے میں جاری نہ رکھا جا سکا۔ آئندہ اس کے لیے جگہ نکالی جائے گی۔

بقیہ خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

اصل یہ ہے کہ معاملہ قرشیت اور غیر قرشیت کا نہیں تھا بلکہ سوال عامۂ مسلمین کے اعتماد کا تھا۔ اس زمانہ میں قریش کو عام مسلمانوں کا جو اعتماد حاصل تھا یا حاصل ہو سکتا تھا اس کی بنا پر وہی خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل تھے، وہ اپنے اس زور و اثر کے سبب سے اگر وہ کسی انصاری یا کسی عجمی نژاد آزاد کردہ غلام کو بھی اپنا معتمد اور خلیفہ بنا لیتے تو وہ بھی اس ذمہ داری کو سنبھال سکتا۔ لیکن ان کے اعتماد کے بغیر کسی کا حکومت چلانا ناممکن تھا۔ اس وجہ سے حضورؐ نے فرمایا کہ خلفاء قریش میں سے ہوں۔ اب آپ خود غور فرمائیے کہ عوام کے اعتماد اور حسن ظن کی بنا پر حکومت چلانے کے معاملہ میں اگر کسی جماعت کو دوسری مقابل جماعتوں پر ترجیح دی جائے تو کیا یہ ترجیح وہ ترجیح ہے جس کے سبب سے اسلام کے اصول مساوات پر کوئی ضرب آئے۔ اس طرح کی ترجیح تو آج کے جمہوری نظاموں میں جمہوریت کا اصلی جمال سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ اسی چیز نے ہمارے ہاں نہ صرف اسلام کے ایک ستون کو ڈھا دیا بلکہ وحدت ملی کے نام سے دوسرے بہت سے ستونوں کو ڈھانے کے لیے ایک بہت بڑے فتنے کو بھی جنم دے دیا۔

ابن خلدون کا نظریہ اس بحث میں محترم معترض کی طرف سے ابن خلدون کے نظریہ کا بھی حوالہ دیا گیا ہے لیکن اس حوالہ کا مقصد واضح نہیں ہوا کہ حوالہ دینے والے بزرگ نے یہ حوالہ اپنی تائید میں پیش کیا ہے یا مخالفت میں۔ بہرحال چونکہ اس کا حوالہ دیا گیا ہے اس وجہ سے ہم مختصر طور پر یہاں ابن خلدون کے سیاسی نظریہ کی بھی وضاحت کیے دیتے ہیں۔

ابن خلدون کے مقدمہ پر جو لوگ گہری نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ ان کے سیاسی نظریہ کی ساری بنیاد سیاسی وحدت و عصبیت کے وجود پر ہے۔ یہ سیاسی وحدت و عصبیت ان کے نزدیک نسل و خون کے اشتراک سے پیدا ہوتی ہے۔ نسل و نسب کا اشتراک باہمی تعاون و تناصر پیدا کرتا ہے اور اس تعاون و تناصر سے حمایت و مدافعت اور حصول اقتدار کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور پھر [illegible] وجود میں آتی ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک سیاسی عصبیت جو حکومت کی بنیاد ہے اگرچہ وجود میں آتی ہے نسل و نسب [illegible] لیکن وہ نسل و نسب کو اسی وقت تک کوئی قابل لحاظ چیز قرار دیتا ہے جب تک اس کا شعور [illegible] تعاون و تناصر کے پیدا کرنے میں مدد و معاون ہو جس کا ذکر ہوا۔ اگر نسب کا اشتراک یہ فائدہ نہیں دے رہا ہے تو

اقتباسات و تراجم

جناب خالد مسعود صاحب

ایک شہنشاہِ وقت اور ایک فقیر بوریا نشین

مرا گر تو بگذاری اے نفسِ طامع
بسے پادشاہی کنم در گدائی

★

حج کا زمانہ تھا۔ امیرالمومنین ہارون الرشید منیٰ میں مقیم تھے۔ منیٰ کا پہلا دن گذر چکا تھا۔ اگلی رات ان کا وزیر فضل بن ربیع دیر تک ان کے پاس رہا۔ جب سونے کا وقت ہوا وہ اپنے خیمہ میں چلا گیا تقریباً آدھی رات گذری ہوگی، فضل بن ربیع سو رہا تھا کہ اس نے دروازے پر دستک سنی۔

اس نے دریافت کیا "کون ہے؟"

"امیرالمومنین یاد کرتے ہیں" جواب ملا۔

وہ جلدی سے باہر نکلا، دیکھا تو امیرالمومنین ہارون الرشید دروازہ پر ہیں۔ بولا "امیرالمومنین آپنے مجھے بلوا لیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا۔"

ہارون نے کہا "خدا تم پر رحم کرے۔ میرے دل میں ایک بات کھٹک رہی ہے، اسے کوئی عالم ہی دور کر سکتا ہے۔ مجھے کسی کے پاس لے چلو تاکہ میں اس سے بات کروں۔"

فضل نے کہا "سفیان بن عیینہ ہلالی آئے ہوئے ہیں۔ وہ حرم شریف کے محدث اور مکہ کے بلند پایہ عالم ہیں۔"

"اچھا انہی کے پاس مجھے لے چلو" ہارون نے کہا۔

فضل کہتے ہیں کہ ہم سفیان کے ہاں گئے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا "امیرالمومنین تشریف لائے ہیں" سفیان بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ امیرالمومنین کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"امیرالمومنین! آپنے مجھے بلا لیا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔"

ہارون نے کہا "ایک اہم بات کے لیے ہمارا آنا ہوا" پھر کچھ دیر ان سے مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں سوال کیا۔

"آپ کچھ مقروض بھی ہیں" سفیان نے کہا "جی ہاں" ہارون نے مجھے ان کا قرض ادا کر دینے کا حکم دیا۔ ہم وہاں سے چلے تو راستے میں امیرالمومنین نے مجھے مخاطب کر کے کہا "کسی اور کے پاس چلو: ان سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

میں نے عرض کی: "پھر عبدالرزاق بن ہمام یمنی صنعانی ہیں"

بولے: "اچھا ان کے پاس چلو"

ہم ان کے پاس گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھوں نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے جواب دیا "امیرالمومنین تشریف لائے ہیں"

وہ جلدی سے باہر نکلے اور امیرالمومنین کو دیکھ کر بولے۔ "آپنے مجھے طلب فرمالیا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتا"

امیرالمومنین نے کہا "ایک اہم مسئلہ ہمارے آنے کا باعث ہوا ہے" پھر تھوڑی دیر ان سے باتیں کیں اور ان سے بھی قرض کی بابت سوال کیا۔ جب معلوم ہوا کہ وہ بھی قرضدار ہیں تو مجھے ان کا قرض ادا کرنے کا حکم دیا۔

جب ہم وہاں سے چلے تو فرمایا "میرے دل کی کھٹک ان کے ہاں بھی دور نہیں ہوئی۔ کوئی اور آدمی تلاش کرو۔"

میں نے کہا "اچھا شیخ حرم فضیل بن عیاض تمیمی ہیں، جو دین کے ائمہ میں سے ہیں۔"

ہارون نے مجھے ان کے پاس لے چلنے کو کہا۔

جب ہم ان کے پاس پہنچے، وہ خیمہ میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور قرآن مجید کی آیات باربار دہرا رہے تھے ـــــ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو انھوں نے دریافت کیا "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا "امیرالمومنین تشریف لائے ہیں، باہر آئیے۔"

بولے "امیرالمومنین سے میرا کیا تعلق؟"

میں نے کہا "**سبحان اللہ! امیرالمومنین** کی اطاعت آپ پر واجب نہیں ہے؟"

انھوں نے دروازہ کھولا، چراغ کی طرف لپکے، اسے گل کردیا اور خود ایک گوشے میں جا چھپے۔ ہم نے ہاتھوں سے انھیں ٹٹولنا شروع کیا۔ ہارون الرشید کا ہاتھ میرے ہاتھ سے پہلے ان تک جا پہنچا۔ بولے:

"کتنی نرم و نازک ہتھیلیاں ہیں اگر یہ کل عذابِ الٰہی سے بھی بچ سکیں!"

میں نے دل میں کہا کہ یہ شخص امیرالمومنین سے آج ایک خداترس دل سے نکلی ہوئی دوٹوک باتیں کہہ کر رہے گا۔

ہارون نے کہا "خدا آپ پر رحم کرے، ایک اہم مسئلہ درپیش تھا جس کے لیے ہم آئے ہیں۔"

فضیل کہنے لگے "کیا مسئلہ ہے؟ بوجھ تو امیرالمومنین! آپ نے اپنا بھی اٹھا رکھا ہے اور ان لوگوں کا بھی جو آپ کے ساتھ ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ اگر آپ ان ساتھیوں میں سے کسی کو اپنے گناہ کا بوجھ اٹھانے کو کہیں گے تو کوئی آپکے کام نہ آئے گا، بلکہ جو آپ کو جتنا ہی زیادہ محبوب ہوگا وہ اسی قدر آپ سے دور بھاگے گا۔"

یہاں فضیل کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے ـــــ ہارون الرشید کا حال یہ تھا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں گھڑی کی آواز کی طرح اس قدر تیز تھیں کہ وہ خود بھی انھیں سنتا ہوگا ـــــ فضیل نے تاریک رات کے پرہیبت سناٹے میں اپنی بات پھر شروع کی ـــــ "جب امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے آپ نے سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب، محمد بن کعب القرظی اور رجاء بن حیوۃ کو بلوایا اور ان سے کہا "مجھے اس آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے۔ مجھے کچھ مشورہ دیجیے کہ کیا کروں" ـــــ ایک وہ تھے کہ خلافت کو انھوں نے ایک آزمائش سمجھ رکھا تھا اور ایک آپ اور آپکے ساتھی ہیں کہ اسے خوانِ نعما سمجھتے ہیں ـــــ سالم بن عبداللہ بولے "امیرالمومنین! اگر آپ کل عذابِ الٰہی سے بچنا چاہتے ہیں تو

مسلمانوں کے بزرگوں کو اپنا باپ، عام لوگوں کو اپنا بھائی اور چھوٹوں کو اپنا بیٹا سمجھیے، پھر باپ سے نیکی کا سلوک کیجیے، بھائی پر رحم کیجیے اور بیٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیے" رجاء بن حیوۃ کا جواب یہ تھا "امیرالمومنین! عذابِ الٰہی سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ آپ مسلمانوں کے لیے وہ پسند کریں جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ جس چیز سے خود آپ کو نفرت ہو اس چیز کو مسلمانوں کے لیے بھی ناپسند کیجیے۔ اگر آپ ایسا کریں تو پھر پروا نہ کیجیے کہ موت کب آتی ہے" ـــــ امیرالمومنین! یہی باتیں میں آپ سے بھی کہتا ہوں۔ میں آپ کے لیے اس دن سے بہت ڈرتا ہوں جس دن لوگوں کے پاؤں پھسلنے لگیں گے۔ خدا آپ پر رحم کرے، ذرا بتائیے تو، آپکے ساتھیوں میں بھی کوئی ان لوگوں جیسا ہے جو آپ کو اس قسم کے مشورے دیا کرے؟"

ہارون یہ باتیں سن کر اس قدر رویا کہ اس پر غشی طاری ہو گئی۔

فضل کہتا ہے کہ میں نے فضیل بن ربیع سے کہا "امیرالمومنین سے آپ ذرا نرمی سے پیش آئیں"

انھوں نے جواب دیا "ابن ربیع! ان کے لیے ہلاکت کا پیغام تو تم ہو یا تمہارے ساتھی اور مجھے ان کے ساتھ نرمی کرنے کی نصیحت کرتے ہو!"

اتنے میں ہارون کو ہوش آیا تو اس نے فضیل سے مزید نصیحت کی درخواست کی۔

فضیل کہنے لگے "امیرالمومنین! میں نے سنا ہے ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیزؒ کو ایک عامل نے یہ شکایت لکھ بھیجی کہ مجھے رات کو جاگنا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؒ نے اسے جواب لکھا "میرے بھائی! دوزخ کی آگ میں دوزخیوں کا سو نہ سکنا اور بلا نہایت پڑے رہنا تمہارے پیش نظر رہے، کیونکہ یہ چیز سوتے جاگتے تمہیں رب کی طرف بڑھنے پر اکساتی رہے گی۔ اس بات سے بچو کہ تمہارے قدم اس راستے سے پھسل جائیں اور اسی حالت میں تمہاری زندگی اور امید دونوں کا خاتمہ ہو جائے" ـــــ جونہی عامل نے یہ خط پڑھا وہ حکومت کا کام چھوڑ چھاڑ حضرت عمرؒ کے پاس آگیا۔ انھوں نے آنے کی وجہ پوچھی، بولا "آپ کے خط نے میرے دل کو ہلا دیا ہے۔ بخدا میں اب کوئی عہدہ قبول نہ کروں گا تا آنکہ مجھے موت آجائے۔"

ہارون یہ سن کر زور زور سے رونے لگا۔ پھر فضیل سے درخواست کی کہ "کچھ اور ارشاد فرمائیے۔"

فضیل نے کہا "امیرالمومنین! حضرت عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ عرض لے کر آئے کہ مجھے کسی جگہ امیر مقرر کیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا "عباس! اپنے نفس کو زندہ رکھیے، یہ اس

امارت سے اچھا ہے جس کا حق آپ ادا نہ کرسکیں ۔ قیامت کے دن یہ امارت حسرت و ندامت کا باعث ہوگی ۔ اگر آپ اس کے بغیر رہ سکتے ہوں تو اس سے ضرور بچیئے "۔

ہارون پھر رونے لگا اور کہا " خدا آپ پر رحم کرے ، اپنا ارشاد جاری رکھیے "۔

فضیل نے فرمایا " آپ ایک ایسے شخص ہیں جس سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ساری رعیت کے بارے میں سوال کرے گا ، اگر آپ اپنے اس چہرہ کو آگ کے عذاب سے بچا سکتے ہوں تو بچانے کی کوشش کیجیے ۔ اس چیز سے ہمیشہ بچیے کہ صبح و شام کسی وقت بھی آپ کے دل میں رعایا کے لیے کچھ کدورت ہو ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس حکمران نے اپنی رعیت کے لیے اپنے دل میں کینہ کو جگہ دی ، وہ جنت کی خوشبو کبھی نہیں پا سکتا "۔

یہ سن کر ہارون پر پھر گریہ کا عالم طاری ہوگیا ۔ جب ذرا سکون ہوا تو اس نے فضیل سے پوچھا " آپ پر کچھ قرض بھی ہے ؟"

فضیل نے جواب دیا " جی ہاں ، میرے رب کا مجھ پر قرض ہے جس کا وہ مجھ سے حساب لے گا ۔ میری بدقسمتی ہے اگر وہ اپنے حساب میں سختی کرے ۔ میری شامت ہے اگر وہ مجھ سے اس کی بابت سوال کرے ، اور میں ہلاک ہوا اگر اس نے مجھے کوئی عذر پیش کرنے کی توفیق نہ دی "۔

" نہیں ، میرا مطلب بندوں کے قرض سے ہے " ہارون نے دوبارہ پوچھا ۔

فضیل کہنے لگے " میرے رب نے مجھے اس کا حکم نہیں دیا ۔ اس نے مجھے اس بات کا حکم دیا ہے کہ اس کے وعدے کو سچا جانوں اور اس کے حکم کی اطاعت کروں ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :- وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ما ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین ٥ (میں نے جن و انس کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں ۔ نہ میں ان سے رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی رزق دینے والا اور زور آور ہے)

ہارون نے ایک ہزار دینار کی تھیلی فضیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا " یہ ایک ہزار دینار قبول فرمائیے ۔ اس رقم کو اپنے اہل و عیال پر خرچ کیجیے اور اپنے رب کی عبادت کے لیے اس سے قوت حاصل کیجیے "۔

فضیل نے جواب دیا " سبحان اللہ ! میں نے تجھے راہ ہدایت کی تلقین کی اور تو مجھے یہ بدلہ دیتا ہے ؟ خدا تجھے سلامت رکھے اور تیری اصلاح کرے ..." ؎؎

؎؎ فضیل بن ربیع کہتا ہے کہ اتنا کہہ کر فضیل بالکل خاموش ہوگئے اور ہم سے پھر کوئی بات نہ کی ۔ کچھ دیر کے